چیخوف

عالمی ادب سے انتخاب

چیخوف

افسانے اور کہانیاں۔ عالمی ادب سے انتخاب

1

ترتیب

منصور بخاری

گوشئہ ادب

جناح روڈ۔کوئٹہ (پاکستان)

فون 092-81-2820375 فیکس 092-81-2837672

Web:- goshaeadab.com

E-mail goshaeadab@yahoo.com

زعیم بخاری نے
سیلز اینڈ سروسز سے
شائع کی۔

چیخوف

کے

افسانے اور کہانیاں

عالمی ادب سے انتخاب

1

سیلز اینڈ سروسز

کبیر بلڈنگ ۔ جناح روڈ۔کوئٹہ (پاکستان)

فون 092-81-2820375 فیکس 092-81-2837672

E-mail goshaeadab@yahoo.com

فہرست

انسان کی تباہی کا باعث اس کی خواہشیں بنتی ہیں ... جس قدر خواہشیں زیادہ ہوں گی انسانی زندگی عذاب بنتی جائے گی ..

چیخوف

ناداری

بوڑھا سمیون' عرف لال بجھکڑ اور ایک نوجوان تاتاری جس کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا' دریا کے کنارے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے باقی تین ملاح جھونپڑی کے اندر تھے۔ سمیون کوئی ساٹھ سال کا کسے ہوئے بدن کا' پوپلا آدمی تھا' اس کے شانے چوڑے چکلے تھے اور چہرے سے ابھی صحت کے آثار ٹپکتے تھے۔ اس وقت وہ نشے کی ترنگ میں تھا۔ اس کی جیب میں شراب کی بوتل تھی اور دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں میرے ساتھی اس میں سے حصہ نہ مانگ بیٹھیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ کبھی کا سو جاتا۔ تاتاری بیمار اور تھکا ماندہ' پھٹے پرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹے' صوبہ سمبرسک کی مزے دار زندگی اور اپنی بیوی کے حسن وذکاوت کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس سال ہوگی۔ مگر الاؤ کی روشنی میں اس کے زرد و بیمار اور مغموم چہرے کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ ابھی لڑکا سا ہے۔

لال بجھکڑ بولا: ''بھئی! یہ جگہ کچھ جنت تو ہے نہیں۔ تم خود ہی دیکھتے ہو کہ سوائے پانی اور دریا کے چٹیل کناروں اور لیسدار مٹی کے کچھ بھی نہیں۔ جاڑا ختم ہو چکنے کو آیا پھر بھی دریا میں برف بہہ کر آ رہی ہے۔ آج سویرے بھی تھی۔''

تاتاری نے کہا: ''مصیبت ہے مصیبت۔'' اور گھبرا کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

دس قدم کے فاصلے پر ٹھنڈا برف کا سیاہ دریا بہہ رہا تھا۔ جھلاتا تھا' کھوکھلے ریتلے ساحل سے ٹکراتا تھا اور کہیں دور سمندر کی طرف تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا' کنارے

سے ملی ہوئی ایک بڑی ناؤ کی سیاہ پرچھائیں نظر آتی تھیں۔ بہت دور دریا کے اس پار' روشنیاں کبھی دھندلی ہو جاتی تھیں' کبھی جھلملانے لگتی تھیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح بل کھاتی تھیں' یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جلائی جا رہی تھی ان سنپولیوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔ ہوا مرطوب اور سرد تھی۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے وطن میں بھی اتنے ہی تارے تھے' چاروں طرف اسی قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی بات کی کمی محسوس ہوتی تھی' صوبہ سمبرسک میں تارے یہاں سے بالکل مختلف تھے اور آسمان بھی دوسرا تھا۔

تاتاری نے پھر کہا ''مصیبت ہے' مصیبت۔''

سمیوں ہنسا ''رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہو جائے گی' ابھی کچے ہو...... منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے۔ اپنی نادانی سے سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ برا حال کسی کا نہیں۔ کوئی دن جاتا ہے۔ اپنے دل میں کہو گے' خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے۔ مجھے دیکھو ہفتہ بھر میں پانی اتر جائے گا۔ ڈونگے چلنے لگیں گے۔ تم سب سائبیریا کا راستہ لو گے' میں یہاں پڑا اس کنارے سے اس کنارے' اس کنارے سے اس کنارے کشتی دھکیلتا رہ جاؤں گا۔ بائیس سال سے میرا دن رات یہی کام ہے۔ پانی کے تلے مچھلیاں' پانی کے اوپر میں' پھر بھی شکر ہے کہ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!''

تاتاری نے آگ میں کچھ خشک ٹہنیاں جھونکیں اور شعلوں کے قریب سکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا ''میرے والد ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ میری ماں اور بیوی وعدہ کر چکی ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد یہاں آ جائیں گی۔''

لال بجھکڑ نے پوچھا ''ماں اور بیوی کو لا کر کیا کرو گے؟ ارے میاں! اس حماقت میں نہ پڑو۔ شیطان ملعون تم کو بہکا رہا ہے۔ اس مردود کی ایک نہ سنو! اس کے دام میں ہرگز نہ آؤ۔ اگر وہ عورتوں کا ذکر چھیڑ کے ورغلائے' تو اسے جلانے کے لیے کہہ دو: مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ آزادی کے بہانے اکسائے تو اس کا مردوں کی طرح مقابلہ

کرو۔ اور کہہ دو: مجھے نہیں چاہئے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بیوی، نہ آزادی، نہ ڈاک، نہ کھیت کھلیان، خدا ان سب کا ستیاناس کرے! مجھے ان میں سے کچھ نہیں چاہئے۔"

لال بجھکڑ نے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ لیا۔ اور پھر بولنا شروع کیا "میں معمولی کسان، مزدوری پیشہ لوگوں میں سے نہیں۔ ایک پادری کا لڑکا ہوں۔ جب آزاد تھا تو کرسک میں رہتا تھا۔ ایک زمانے میں میں بھی فراک کوٹ ڈانٹا کرتا تھا۔ مگر میں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے کہ زمین پر ننگا سو سکتا ہوں۔ اور ضرورت پڑے تو جڑی بوٹی پر گزارا کرنے کو تیار ہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! نہ منہ سے کچھ مانگتا ہوں۔ نہ دل میں کسی سے دبتا ہوں۔ اپنے سے زیادہ شاد اور آزاد کسی کو نہیں سمجھتا۔ جس دن سے روس سے یہاں بھیجا گیا، میں نے دل کڑا کر کے ٹھان لی: مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ شیطان نے مجھے بھی، بیوی، گھر، آزادی کا دام دے دے کر پھسلانا چاہا۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا: مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ اور اپنے خیال پر جما رہا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کتنے مزے میں ہوں۔ کسی بات کی مطلق شکایت نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ جو ذرا سا شیطان کے پھیر میں آیا۔ اور اس کا فیصلہ ہوا۔ پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ چندیا تک دلدل میں دھنس جائے گا۔ اور نکالے نہیں نکلے گا۔

تم دہقان لوگ ہی شیطان کی چالوں میں نہیں آتے۔ خاندانی پڑھے لکھے لوگ بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذکر ہے کہ ایک شخص روس سے جلاوطن ہو کر یہاں پہنچا۔ بھائیوں میں جائیداد کی تقسیم اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا۔ لوگ سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ ضرور کوئی شہزادہ یا جاگیردار ہے، یہ بھی ممکن ہے، صرف معمولی سرکاری ملازم ہو۔ کسی کو کیا معلوم؟ خیر، تو وہ صاحب یہاں تشریف لائے۔ اور آتے ہی انہوں نے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی۔ فرمانے لگے "میں خود روزی کما کر کھاؤں گا۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر گزارا کروں گا۔ میں اب رئیس نہیں رہا۔ معمولی جلاوطن ہوں" میں نے سن کر کہا: ارادہ تو بہت نیک ہے!"

وہ اس وقت نو جوان تھا۔ مزاج میں دوڑ دھوپ کے ساتھ احتیاط کا مادہ بھی تھا۔ خود گھاس کاٹتا اور مچھلیاں پکڑتا' گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اس کے لئے معمولی بات تھی۔ مگر آگے چل کر یہ نقشہ بدل گیا۔ پہلے ہی سال گھوڑے پر چڑھ کر ڈال لینے گائی رینو آنے جانے لگا۔ میری کشتی میں کھڑا ہو جاتا۔ اور ٹھنڈا سانس کھینچ کر کہتا۔ کیوں سمیوں! گھر والوں نے کتنے عرصہ سے خرچ نہیں بھیجا! میں کہتا: ویسیلائی سر گے یوچ' روپے کی تمہیں ضرورت نہیں' روپیہ لے کر کیا کرو گے؟ اگلے زمانہ کو بھلا دو۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں' یا اگر تھا بھی تو محض ایک خواب تھا۔ نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔ شیطان کی گھاتوں میں نہ آؤ! اس کا انجام برا ہوگا' اس کے جال میں پھنس جاؤ گے۔ ابھی تو صرف روپیہ چاہتے ہو' تھوڑے دنوں میں کچھ اور چاہو گے۔ پھر کچھ اور' پھر کچھ اور...... خوش رہنے کی ترکیب یہ ہے کہ کسی چیز کی خواہش نہ کرو...... اگر تقدیر نے ہم پر تم پر زیادتی کی' تو اس کے آگے ہاتھ پھیلانے اور سر جھکانے سے فائدہ؟ چاہئے یہ کہ اسے ٹھکراؤ' اس کا مذاق اڑاؤ' نہیں تو وہ تمہارا مذاق اڑائے گا' میں اسے یہ مشورہ دیتا رہا۔

اس کے دو سال بعد مجھے اس دریا کے اسے پار اتارنے کا اتفاق ہوا۔ خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا تھا۔ کہنے لگا' اپنی بیوی کو لینے گائی رینو جا رہا ہوں' آخر اس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ یہاں آنے پر رضا مند ہو گئی۔ کتنی نیک اور مہربان ہے! اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں' دوسرے دن وہ بیوی سمیت واپس ہوا۔ وہ سر پر ٹوپی لگائے ایک نوجوان بانکی عورت تھی' گود میں ایک دودھ پیتی بچی تھی' اور متوں میں مختلف قسم کا مال اسباب' سر گریوچ صاحب اس کا طواف کر رہے تھے۔ کیا مجال ہے جو آنکھیں دم بھر کو بیوی کے چہرے سے اُٹھ جائیں' اس کی تعریف میں ان کا منہ سوکھتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے: ہاں! بھائی سمیوں' لوگ سائے بیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں' میں نے دل میں کہا' یہ چند دن کی بہار ہے' رت بدلتے دیر نہیں لگتی' اس دن سے ہر ہفتہ اس کا معمول بندھ گیا کہ ڈاک خانہ جا کر پوچھتے کہ گھر سے روپیہ تو نہیں آیا۔

ایک دن مجھ سے کہا' میری خاطر وہ اپنا حسن' اپنی جوانی سائے بیریا میں گنوا رہی

ہے اور میرے ساتھ کڑیاں جھیل رہی ہے' لہٰذا مجھ پر واجب ہے کہ اس کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھوں' بیگم صاحبہ کا جی بہلانے کے لئے اس نے مقامی افسروں اور ایرا غیرا سب سے راہ و رسم پیدا کی' پھر لازم ہوا اس لشکر کی خاطر تواضع کا بندوبست ہو' ضروری سمجھا گیا کہ ایک پیانو خریدا جائے۔ اور صوفہ پر ایک بالوں والا گدو کا کتا ہو۔ غارت ہو کم بخت! الغرض' ہر طرح کے ٹھاٹ' بلکہ عیاشی ہونے لگی' اس پر بھی وہ نک چڑھی بیگم زیادہ عرصہ تک اس کے پاس نہ ٹکیں اور ٹکتیں بھی کیوں؟ کیچڑ اور پانی' کڑاکے کی سردی' نہ پھل نہ پھلواری' لوگوں کو دیکھو تو جاہل' شرابی' جنہیں نہ اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ' نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ اور وہ ٹھہریں ماشاء اللہ پیٹرس برگ یا ماسکو کی مزاج دار خاتون...... یہاں ان کے لئے مکھیاں مارنے کے علاوہ کیا دھرا تھا' اس پر طرہ یہ کہ خاوند کی حیثیت بھی پہلے سے گر گئی تھی۔ ایک بیچارے جلاوطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

اس کے تین سال بعد کا ذکر ہے' مجھے خوب یاد ہے کہ لیلۃ القدر کی شام کو پرلے کنارے سے کسی نے زور سے پکارا' میں ناؤ ادھر لے کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی بیگم صاحبہ کانوں تک اوڑھنی لپیٹے کھڑی ہیں' اور پہلو میں ایک نوجوان افسر ہے۔ ایک تکڑی ساتھ جتی کھڑی ہے...... میں نے انہیں پار اتار دیا' وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا' ہوا ہو گئے' اگلے دل علی الصباح گھوڑا اڑائے ویسیلائی سرگے یوچ صاحب گھاٹ پر نمودار ہوئے۔ پوچھنے لگے: سمیوں! میری بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ پار نہیں گئی؟ میں نے جواب دیا: جی ہاں! اب میدانوں میں جا کر ہوا پر چنگل ماریئے!' اس نے ان کے پیچھے بگٹٹ گھوڑا ڈال دیا' دن رات پانچ روز تک ان کا تعاقب جاری رکھا۔ واپسی پر جب میں اسے پار اتار رہا تھا۔ تو وہ بے دم ہو کر میری کشتی میں ڈھیر ہو گیا۔ اور اپنا سر تختوں پر پٹختا اور چیخیں مار مار کے روتا رہا۔ میں نے کہا: تو یہ معاملہ ہے۔' ہنس کے اسے یاد دلایا کہ لوگ سائبیریا میں بھی لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں! وہ اپنا سر اور زور سے پیٹنے لگا۔

اس کے بعد آزادی کی ہوس اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اس کی بیوی فرار

ہو کر روس پہنچ چکی تھی، اس کے دل میں ہوک اٹھی کہ جا کر اسے عاشق کے پنجے سے چھڑاؤں، میاں! اس دن سے وہ مارا مارا صبح شام گھوڑے دوڑائے پھرنے لگا۔ کبھی ڈاک خانہ ہے، تو کبھی کمیدان کا دفتر، عرضیوں کا تانتا باندھ دیا کہ میرے حال پر رحم کیا جائے۔ اور روس واپس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ زمین بیچ ڈالی۔ مکان یہودیوں کے ہاتھوں رہن کر دیا۔

بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ چہرہ دق کے ماروں کی طرح زرد پڑ گیا۔ بھلا چنگا ایکا ایکی کھی کرنے لگتا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ اس طرح آٹھ سال تک عرضیوں کا تار باندھے رکھا۔ مگر اب پھر اس کی جان میں جان آ گئی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ خیر سے بیٹی کے سیانے ہونے سے ایک نیا بہلاوا ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے اور آنکھ کی پتلی کی طرح رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لڑکی میں کسی قسم کا عیب نہیں، اچھی شکل، کالی کالی بھنویں، مزاج میں شوخی، ہر اتوار کو اسے ساتھ لے کر گرجا جاتا تھا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے، لڑکی مسکراتی، اور باپ کی نظریں بیٹی کے مکھڑے سے پل بھر کو اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ کہتا: ہاں سمیوں سائے بیریا میں بھی زندگی لطف سے بسر ہو سکتی ہے، سائے بیریا میں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ میری بیٹی کو دیکھو ماشاء اللہ کتنی پیاری ہے! میں شرط لگاتا ہوں کہ اتنی پیاری لڑکی تم چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہیں پا سکتے، میں جواب دیتا، بے شک، تم ٹھیک کہتے ہو، تمہاری لڑکی میں کوئی خرابی نہیں، اور اپنے دل میں کہتا، ذرا صبر کرو......اس کی اٹھتی جوانی ہے۔ خون میں ابال ہے، جی میں مرادیں ہیں۔ یہاں بھلا راگ رنگ کہاں؟ اور میاں، لڑکی سچ مچ گھلنے لگی، سوکھتی گئی، سوکھتی گئی، اور ایڑیاں رگڑ رگڑ رینگ رہی ہے، دق......''

دیکھ لی آپ نے سائے بیریا کی خوشی، لعنت ہو کم بخت پر! یہاں زندگی اس طور سے بسر ہوتی ہے...... خیر، تو اب ڈاکٹروں کی ڈھونڈ مچی، ایک کو چھوڑا، دوسرے کو پکڑا۔ آج اسے دکھا، کل اسے، جہاں کسی ڈاکٹر یا جادوگر کا پتہ چلا اور اسے لینے پہنچا، ڈاکٹروں کے پیچھے ہزاروں روپیہ برباد کر دیا۔ میرے نزدیک تو بہتر ہوتا کہ یہ روپیہ شراب میں اڑا

دیتا' لڑکی تو مر کر رہے گی' اب کسی کے بچائے نہیں بچتی' پھر اس کی کمر ٹوٹ جائے گی' اور اس کا یقین رکھو کہ یا تو صدمے سے خودکشی کرے گا۔ یا روس بھاگ جائے گا' فرار ہوگا' پکڑا جائے گا' مقدمہ چلے گا' سزا ہوگی؟''

تاتاری نے جو سردی میں سکڑ رہا تھا' بڑبڑا کر کہا'' اچھا ہے' اچھا ہے' اچھا ہے! کیا اچھا ہے؟''

اس کی بیوی' اس کی بیٹی......اس کے مقابلہ میں قید کی' صدمے کی کیا حقیقت ہے! اپنی بیوی' اپنی بیٹی کی شکل تو دیکھنے کو مل گئی......تم کہتے ہو: کچھ نہ مانگو' یہ نہوت بری' اس کی بیوی تین سال تک اس کے ساتھ رہی' یہ پروردگار کی دین تھی' نہوت بری' تین سال اچھے' کچھ سمجھے بھی۔

سردی سے اٹک اٹک کے اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے روسی لفظ سوچ سوچ کر (اسے صرف گنتی کے روسی لفظ آتے تھے) تاتاری نے کہنا شروع کیا' کہ خدا وہ گھڑی نہ لائے کہ کوئی بیمار پڑے اور پردیس میں جان دے' اور ٹھنڈی' کالی زمین میں گاڑا جائے' میری بیوی میرے پاس دن بھر نہ سہی گھنٹہ بھر کو آ جائے' تو اس نعمت کے بدلے میں ہر طرح کا دکھ درد سہہ لوں گا' اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا' خوشی کا ایک دن نہوت سے اچھا۔

وہ پھر اپنی حسین و ذہین بیوی کی حکایت لے بیٹھا' پھر اس نے اپنا سر ہاتھوں میں پکڑ لیا' اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' سمیوں کو اس نے یقین دلایا کہ میں بے گناہ ہوں' اور مفت میں مصیبت بھگت رہا ہوں' میرے دو بھائیوں اور چچا نے مل کر اس کسان کے گھوڑے پر ہاتھ صاف کیا تھا' اور انہی نے گھوڑے والے کو مار مار کے ادھ موا کیا تھا' پنچائت نے انصاف سے کام نہیں لیا' بلکہ کچھ ایسی کاری گری کی' کہ ہم بھائیوں کو کالا پانی ہو گیا' اور ہمارا پیسے والا چچا صاف چھٹ گیا۔

سمیوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا' کچھ دلوں میں خوبخود جی لگ جائے گا۔

تاتاری دم بخود بیٹھا اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھتا رہا۔

چہرے سے ویرانی اور تردد پڑا ٹپکتا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں گھر سے اتنی دور اس تاریکی اور نمی میں انجان لوگوں کی صحبت میں پڑا سڑ رہا ہوں۔

لال بجھکڑ آگ کے قریب لیٹے لیٹے کسی بات کا دھیان کر کے آپ ہی آپ ہنسا اور دھیمی لے سے دھن گنگنانے لگا۔

تھوڑی دیر میں بولا' لڑکی کے لئے باپ کی صحبت میں کیا لطف؟ یہ ضرور ہے کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر بھائی اسکے سامنے انسان کو اپنے ش۔ق کا خیال رکھنا پڑتا ہے' بڈھا مزاج کا سخت اور چڑچڑا ہے' جوان لڑکیوں کو بھلا سختی سے کیا سروکار؟ انہیں تو چاؤ چونچلے چاہئیں اور ہاہاہا! ہو ہو ہو' عطر چاہئے اور غازہ چاہئے۔ جی ہاں...... آہ زندگی' زندگی!' سمیوں نے وقت کے ساتھ اٹھتے ہوئے ایک آہ کھینچی۔ شراب ختم۔ معلوم ہوتا ہے۔ سونے کا وقت آ پہنچا۔ میاں' میں تو چلا......''

تاتاری اکیلا رہ گیا' تو اس نے الاؤ میں کچھ اور ٹہنیاں ڈالیں۔ لیٹ رہا۔ اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھ کر اپنی بیوی کے تصور میں ڈوب گیا۔ مہینہ بھر' دن بھر کو وہ میرے پاس آ جائے۔ خواہ جی چاہے' تو پھر چلی جائے۔ ایک مہینہ یا ایک دن سدا کی محرومی سے بہتر ہے۔ اچھا' فرض کرو' اس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ اور وہ آ بھی گئی۔ آخر کھائے گی تو کیا کھائے گی؟ رہے گی تو کہاں رہے گی؟

سوچتے سوچتے اس کی زبان سے نکلا' کھانے کو کچھ نہ ہوا تو رہے گی کیونکر؟ دن رات چپو چلانے پر بھی کلھم' دس کوپک اس کے پلے پڑتے تھے' یہ سچ ہے کہ سواریاں شراب یا چائے کے لیے کچھ بخشش دے دیتی تھیں۔ وہ دوسرے ملاح آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اور نہ صرف بیچارے تاتاری کو سوکھا ٹرخاتے تھے' بلکہ اس کا اُلٹا مذاق اُڑاتے تھے' خرچ کی تنگی کی وجہ سے وہ بھوک' سردی اور دہشت کا شکار تھا۔

اب کہ وہ سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا' اور اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹا جاتا تھا۔ چاہئے تھا کہ وہ جھونپڑی میں جا کر پڑ رہتا' اور سو جاتا' مگر وہاں اس کے پاس اوڑھنے کو کوئی چیز نہ تھی' اور اندر سردی باہر سے بھی زیادہ تھی' ساحل پر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ

تھا، مگر کم از کم آگ تو دہکا سکتا تھا۔

ہفتہ بھر میں پانی اتر جائے گا اور چھوٹے ڈونگے چلنے لگیں گے اور سوائے سمیوں کے کسی ملاح کی ضرورت نہیں رہے گی، تب تاتاری گاؤں گاؤں روزگار ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھرے گا۔ اس کی بیوی صرف سترا سال کی تھی، خوب صورت، نازک مزاج، شرمیلی، کیا وہ بھی شرم وحیا چھوڑ، نقاب الٹ در بدر جھولی لئے پھرے گی؟ نہیں! اس کے خیال ہی سے اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

پو پھٹ رہی تھی، کشتی، پانی میں بید مجنوں کی جھاڑیاں، دریا کی لہریں صاف چمکنے لگی تھیں، پلٹ کر دیکھنے سے ترچھی ریتلی ڈھال نظر آتی تھی، اس کے دامن میں چھپر کی جھونپڑی تھی، ذرا اوپر گاؤں کی جھونپڑیاں پاس پاس پڑی تھیں، گاؤں میں مرغ بانگ دینے لگے تھے۔

تاتاری سوچنے لگا کہ یہ سرخ ریتلی ڈھال، کشتی، دریا، اجنبی کھرے لوگ، بھوک، پیاس، بیماری، شاید یہ سب مایا ہو، بعید نہیں کہ یہ سب کچھ صرف خواب نکلے، اسے ایسا معلوم ہوا کہ میں سو رہا ہوں، اور اپنے خراٹوں کی آواز میرے کان میں آ رہی ہے...... وہ اپنے وطن سمبرسک میں ہے، اس نے اپنی بیوی کو نام لے کر پکارا، اور وہ بولی۔ دوسرے کمرے میں اس کی ماں ہے۔ لوگ کیسے کیسے دردناک خواب دیکھتے ہیں، خواب آخر آتے کیوں ہیں؟ تاتاری نے مسکرا کر آنکھیں کھولیں۔ یہ کون سا دریا ہے؟ والگا؟

برف پڑ رہی تھی۔

"کشتی!" دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی شخص چیخ رہا تھا، "کشتی!"

تاتاری چونک کر اٹھ بیٹھا اور دوسری طرف جانے کے لئے اپنے ساتھیوں کو جگانے لگا، رواروی میں پھٹی پرانی بھیڑ کی کھالیں پہن، اپنی بھاری، نیند بھری آواز میں گالیاں دیتے، سردی سے ٹھٹھرتے ملاح گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کچی نیند سے اٹھ کر دریا کی تیز ہوا ان کے بدن کے پار ہوئی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ سب اچھل کر کشتی میں سوار ہوئے...... تاتاری اور تین اور ملاحوں نے بڑے بڑے، چوڑے پھل کے چپوار

سنبھالے جو اندھیروں میں کیکڑوں کے پنجے معلوم ہوتے تھے' سمیوں پیٹ کے بل پتوار کر پیرم کے سہارے لیٹ گیا' دوسرے کنارے سے چیخنے کی آواز بدستور آ رہی تھی' دو مرتبہ جھنجھلا کر شاید اس خیال سے چلایا گیا کہ ممکن ہے ملاح سو رہے ہوں' یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوئے ہوں۔

''سن لیا' آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟'' لال بجھکڑ کے لہجے سے ٹپکتا تھا کہ اس میں جلدی کرنا فضول ہے' یا کم از کم جلدی کا کوئی نتیجہ نہیں۔

لمبی چوڑی' بھدی ناؤ کنارے سے روانہ ہوئی' اور بید مجنوں کی جھاڑیوں میں سے ہو کر چلنے لگی' درخت چلتے نظر آتے تھے۔ اور صرف اسی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کشتی ساکن نہیں' بلکہ حرکت میں ہے' ملاح بجے تلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے' لال بجھکڑ پیٹ کے بل کمان کی شکل لیتا تھا' کبھی اس طرف کو لڑھک جاتا کبھی اس طرف کو۔ اندھیرے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملاح کسی باوا آدم کے وقت کے لمبے لمبے پنجوں والے دقیانوسی جانور کی پشت پر بیٹھے ایک برفانی لق و دق ملک میں سے جا رہے ہیں' ایک ایسے ملک میں جو کبھی کبھی ڈراؤنے خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ ناؤ بید مجنوں کی جھاڑیوں سے نکل کر کھلے دریا پر بہنے لگی' چپوؤں کے برابر چلنے کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر سنائی دیتی تھی' کوئی شخص چلائے جا رہا تھا۔

''جلدی کرو! جلدی کرو!''

دس منٹ کے بعد ناؤ زور سے گھاٹ سے جا کر ٹکرائی۔

سمیوں اپنے منہ سے برف پونچھتے ہوئے بڑبڑایا۔ برف کی بوچھاڑ ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آتی' خدا جانے اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے۔

کنارے پر ایک میانہ قد و قامت کا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے' سفید بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اوڑھے' بے حس و حرکت اپنے گھوڑے سے الگ ہٹ کر کھڑا تھا۔ غم و اندوہ اور از خود رفتگی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ گویا کوئی بھولی بسری بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے ناقص حافظہ پر دانت پیس رہا ہے' سمیوں اس

کے قریب پہنچا اور مسکرا کر ٹوپی اتاری' اس نے کہا: ''مجھے انستا سائیفسکا جانے کی جلدی ہے۔ میری لڑکی کی حالت پھر خراب ہوگئی' سنا ہے کہ وہاں کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔''

گاڑی ناؤ میں دھکیلی گئی اور ملاحوں نے اسے بہاؤ کے خلاف کھینچنا شروع کیا۔ وہ شخص جسے سمیوں نے ویسیلانی سرگے یوچ کے نام سے پکارا تھا' بالکل ساکت کھڑا اپنے موٹے موٹے ہونٹ دبائے ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ کوچوان نے اس سے سگریٹ پینے کی اجازت مانگی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ سمیوں نے اس کی طرف طنز کی نظر سے دیکھا۔ اور کہا ''جی ہاں'' سائبیریا میں بھی لوگ لطف سے زندگی بسر کر سکتے ہیں' لطف سے! لال بجھکڑ کے چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا' جیسے اس نے کوئی بات ثابت کردی' اور اسے خوشی ہے کہ میری پیشین گوئی پوری ہو کے رہی' صاف ظاہر تھا کہ وہ ویسیلانی سرگے یوچ کی غمزدہ بے بسی سے بہت لطف اٹھا رہا ہے۔

جب گھوڑے ساحل پر پہنچ کر جوتے جانے لگے' تو اس نے کہا ''ویسیلائی سرگے یوچ اس موسم میں آپ کو بہت کیچڑ ملے گی' آپ کو چاہئے تھا کہ ابھی زمین کے سوکھنے تک توقف کرتے' یا سرے سے سفر کا خیال ہی دل سے نکال دیتے' سفر سے کچھ حاصل ہو' تب بھی ایک بات ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ سالہا سال سے دن رات ادھر سے ادھر حیران و پریشان مارے مارے پھرتے ہیں' ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ خاک نہیں نکلتا۔''

ویسیلائی سرگے یوچ چپ چاپ اسے انعام دے کر گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔

سمیوں نے سردی سے سکڑ کر کہا ''پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش! گویا معقول ڈاکٹر کا ملنا اتنا ہی آسان ہے' جتنا میدان کی ہوا کا' یا شیطان ملعون کی دم کا ہاتھ آنا' عجب آدمی ہے! خدایا' مجھ گناہ گار کو معاف کرا!''

تاتاری' لال بجھکڑ کے قریب پہنچا' اور تھوڑی دیر تک اسے نفرت اور بیزاری کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی سے تھرتھراتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی روسی میں تاتاری

الفاظ گڈ مڈ کر کے اس نے کہنا شروع کیا'' وہ نیک ہیں' نیک اور تم برے ہو! تم برے ہو! ان کی روح پاک ہے اور تم حیوان ہو' پلید! وہ زندہ ہیں اور تم ایک مردہ لاش ہو۔ خدا نے انسان کو اس لئے بنایا ہے کہ دکھ سکھ سہے' تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں' تم بے جان ہو...... تم پتھر ہو' مٹی کا ڈھیر ہو!

اللہ میاں تمہیں نہیں چاہتا' انہیں چاہتا ہے!''

ملاح ہنسنے لگے' تاتاری کی پیشانی پر حقارت سے بل آ گیا۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے اس نے اپنے پھٹے پرانے چیتھڑے بدن سے لپیٹ لئے' اور الاؤ کے قریب چلا گیا۔ سمیوں اور دوسرے ملاح ٹہلتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک ملاح خشک گھاس پر لیٹے ہوئے بھاری آواز میں بولا'' سردی ہے!''

دوسرے نے اتفاق کیا'' ہاں! گرمی نہیں ہے' زندگی کیا ہے جنجال ہے......''

سب لیٹ گئے' دروازہ ہوا کے جھونکے سے کھل گیا' اور برف کی بوچھاڑ اندر آنے لگی' کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔

سمیوں غنودگی کا جھونکا آتے وقت بولا'' میں تو مزے میں ہوں' خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!''

'' تمہاری دلاوری کا لوہا ہم سب مانتے ہیں' شیاطین بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے!''

باہر سے ایسی چیخیں آئیں جیسے کوئی کتا بھوں بھوں کر رہا ہے۔

'' کیا ہے؟ کون ہے؟''

'' تاتاری باہر بیٹھا سو رہا ہے۔''

'' عجب دیوانہ ہے!''

سمیوں نے کہا'' رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔'' اور فوراً اس کی آنکھ لگ گئی۔ باقی لوگ بھی تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دروازہ کھلا پڑا رہا۔

چیخوف جانوروں کی وفاداری انسانوں کی بے مروتی اور انسانی نفسیات۔۔

خود بیتی

شام کا جھٹپٹا' گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے اردگرد جو ابھی جلائے گئے ہیں' دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں۔ چھتوں پر' گھوڑوں کی پیٹھ پر' بازوؤں پر' ٹوپیوں پر' برف کی باریک' نرم تہہ جمی ہوئی ہے۔ گاڑی بان ایونا' بھوت کی طرح سفید براق' کوچ بکس پر بے حس و حرکت گٹھڑی بنا بیٹھا ہے۔ اس سے زیادہ جھکنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں تب بھی انہیں جھٹکنا ضروری نہیں سمجھے گا۔ اس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی سفید اور ساکت ہے۔ اس کے سکوت' جسم کے پیچ و خم' اور بانس کی سی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اس پر ٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس غریب کو ہل مکھسر سے' ان مٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں' زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے۔ جہاں ڈراؤنی روشنیاں' غل غپاڑا' لوگوں کی لگاتار انتھک دوڑ دھوپ ہو' وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے؟

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی' دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی۔ شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے' بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے۔ اور سڑک کا شور و شغب بڑھ رہا ہے۔

''وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی!'' ایونا کے کان میں آواز آتی ہے: ''گاڑی!''

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے۔

''وائی برگ اسکایا کو!'' افسر پھر کہتا ہے۔ ''سو رہے ہو؟ وائی برگ اسکایا کو!''

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے' برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور پٹھوں پر سے ہوا میں اُڑتے ہیں' افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے' گاڑی بان گھوڑی کو لکارتا ہے۔ بط کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے' اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے' اور گو اس کی ضرورت نہیں' مگر عادت کے مطابق چابک چٹخاتا ہے۔ گھوڑی بھی گردن آگے کو نکالتی ہے' اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے اور بادل ناخواستہ چلنے لگتی ہے۔

تاریکی کے انبار میں سے جو اس کے سامنے اِدھر سے اُدھر گردش کر رہا ہے' ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے' شیطان' کہاں گھسا چلا آتا ہے؟ کدھر پلا پڑتا ہے؟ ذرا دائیں کو چل!

''تمہیں چلانا نہیں آتا! دائیں کو چلاؤ'' افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے' اسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں۔ وہ اس کی طرف غصے کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا بکس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے' جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے' کہ کہاں ہوں' اور جہاں ہوں' وہاں کیوں ہوں۔

''یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں!'' افسر از راہِ تمسخر کہتا ہے ''پوری کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں' یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں' ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں''۔

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے' اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے...... بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے' مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

''کیا کہا؟'' افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے۔ اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے:

''میرا لڑکا...... میرا لڑکا اس ہفتہ گزر گیا' حضور''۔

''ہوں! کیا شکایت تھی؟''

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

''خدا جانے! بخار ہو گا...... تین دن ہسپتال میں پڑا رہا' اس کے بعد گزر گیا' جو خدا کی مرضی''۔

''شیطان مڑ کر دیکھ!'' اندھیرے سے آواز آتی ہے۔ ''کتے۔ باؤلا ہو گیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ کدھر چلا جا رہا ہے!''

''چلے چلو! چلے چلو!'' افسر کہتا ہے۔ ''اس رفتار سے تو کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے' تیز چلو!''

گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے' اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے' چابک گھماتا ہے' کئی بار پھر کر افسر کی طرف دیکھتا ہے' افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں' اور بات چیت کرنا نہیں چاہتا۔

وائی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خانے کے پاس گاڑی کھڑی کرتا ہے' اور پھر سکڑ کر بکس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گزرتا ہے' پھر دوسرا......

تین نوجوان' دو کشیدہ قامت' اور دبلے پتلے' ایک پستہ قد اور کبڑا' ایک دوسرے پر فقرے کستے' اپنے برساتی جوتے پہنے' کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اس طرف آتے ہیں۔

''گاڑی بان! لولس کے پل کو چلو!'' کبڑا جھوجھری آواز سے چلاتا ہے۔ ''تینوں کے...... بیس کوپک!''

ایونا باگ کھینچتا ہے' اور گھوڑی کو للکارتا ہے۔ اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اسے اس کا خیال نہیں' ایک روبل ہو یا پانچ کوپک' اس کی پرواہ نہیں بس سواری مل جائے۔ تینوں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے' بدزبانی کرتے' گاڑی کی طرف آتے ہیں۔ اور تینوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں۔ تصفیہ طلب سوال یہ ہے' کون سے دو بیٹھیں اور کون کھڑا رہے۔ لمبے چوڑے بحث مباحثے' تو تو میں میں' گالی گلوچ کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کبڑا کھڑا رہے' کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے۔

''چلو'' کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے' ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے۔

''فروٹ ہو جاؤ! دوست' تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے' اس سے ردی ٹوپی سارے پیٹر

برگ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی"۔

"ہی ہی! ہی ہی!" ایونا ہنستا ہے۔ "بس گزارے کے لائق ہے"۔

"خیر! جناب گزارے کے لائق، ذرا تیز چلئے! تمام راستے اسی چال سے چلو گے؟ کیوں؟ دوں تان کر ایک چٹاخا؟"

"میرا سر پھٹا جاتا ہے" کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "دکما سوف کے ہاں کل واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے"۔

"سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو" دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا ہو کر کہتا ہے۔ "وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو"۔

"اپنی جان کی قسم! سچ کہتا ہوں!"

"یہ ایسا ہی ہے، جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے"۔

"ہی ہی!" ایونا ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں!"

"مردود!" کبڑا غصے میں آ کر چیختا ہے، چلاتا ہے۔ "ملعون سنتا نہیں؟ گاڑی یوں چلائی جاتی ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک۔ کم بخت کی چابک سے خبر لے"۔

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ملنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے، وہ سنتا ہے کہ مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں۔ لوگوں کو دیکھتا ہے، اور تنہائی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا ہے، کبڑا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے لچھے دار گرم گرم فقروں سے اس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے، اور کھانسی اس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اس کے کشیدہ قامت رفیق ندائز ذا پتر دونا ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ ایونا ان کی طرف دیکھتا ہے، تھوڑی دیر انتظار کر کے، جب وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں، تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

"اس ہفتے...... میرا...... لڑکا گزر گیا!"

"سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے" کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ "خیر تیز چلاؤ تیز۔ یارو! مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی! نہ معلوم

کب پہنچائے گا؟''

''ذرا اس کی ہمت بڑھاؤ...... لگاؤ گردن پر ایک ہاتھ!''

''ملعون سنتا ہے؟ مزا چکھا دوں گا' تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا بھتنے' سنتا ہے؟ یا جو کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں' تیری جوتی کی نوک سے؟''

ایونا کی پیٹھ پر تھپڑ پڑتا ہے' جس کا تڑاخا اسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

''ہی ہی!'' وہ ہنستا ہے۔ ''صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں' خدا آپ صاحبوں کو سلامت رکھے!''

''گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟'' ایک کشیدہ قامت پوچھتا ہے۔

''میری ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گیلی مٹی ہی میری دلہن بنے گی......''

''ہو ہو ہو! یعنی قبر! ذرا سوچو' میرا بیٹا چل بسا' اور میں ہٹا کٹا موجود ہوں' عجب معاملہ ہے۔ موت اٹکل پچو زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجائے میرے لڑکے کو جا دبوچا......''

ایونا مڑ کر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سنتا ہے' مگر یہاں پہنچ کر کبڑا ہلکی سی آہ بھر کر کہتا ہے: ''شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے''۔ اپنے بیس کوپک لے کر ایونا دیر تک ان اوباشوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے' وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی' وہی ہو کا عالم چھا جاتا ہے۔ جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا تھا' وہ پھر ابھر آتا ہے اور اس کے دل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے۔ اس کی نظروں سے غم و اندوہ ٹپکتا ہے' وہ بے چین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں ڈالتا ہے۔ کیا اس ہزاروں کے مجمعے میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں۔ جو اس کی دکھ بھری کتھا سنے؟ لوگ اس سے' اس کے غم سے غافل گزر چلے جاتے ہیں...... اس کا غم بے انتہا سخت' اندازے سے باہر ہے' اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اس سے پھوٹ بہے' تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے' پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس نے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ

نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ دکھائی دے......

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے' جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے' وہ اس سے بات چیت کرنے کی ٹھانتا ہے۔

''بھئی کیا وقت ہوگا؟''

''دس بجا چاہتے ہیں...... یہاں کیوں کھڑے ہو؟ آگے بڑھو!''

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے' اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے' اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی اُمید رکھنا بے سود ہے۔ پانچ منٹ نہیں گزرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے اور باگ کھینچتا ہے...... اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

''واپس اصطبل کو!'' اپنے دل میں کہتا ہے۔ ''اصطبل کو!''

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک غلیظ بڑے آتش دان کے پاس بیٹھا ہے' آتش دان پر' فرش پر' بنچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بو میں بسی ہوئی اور کثیف ہے۔ ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا۔ مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے' سوچتا ہے' یہی وجہ ہے کہ میں اتنا غمگین ہوں جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے...... جسے پیٹ بھر کھانے کو میسر ہے' جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے' وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے......

ایک کونے میں سے ایک نوعمر گاڑی بان اُٹھتا ہے' کچھ سوتے' کچھ جاگتے کھنکھارتا ہے۔ اور پانی کی بالٹی کا رخ کرتا ہے۔

''کچھ پیو گے؟'' ایونا پوچھتا ہے۔

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے''۔

''خدا راس لائے!...... بھئی' دیکھو میرا بیٹا گزر گیا...... سنتے ہو؟ اس ہفتے ہسپتال میں...... عجیب معاملہ ہے''۔

ایونا دیکھتا ہے کہ اس کے لفظوں کا کیا اثر ہوا' مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ نوجوان اپنا منہ

لپیٹ کر سو جاتا ہے۔ بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا بدن کھجاتا ہے...... جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس تھی' اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے' اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا' اور اب تک اسے کسی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہ اس بارے میں ٹھکانے سے جی بھر کر باتیں کرنی چاہتا ہے...... وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا' اس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں' مرتے وقت کیا کہا' کیونکر مرا...... وہ چاہتا ہے کہ جنازے کا حال سنائے اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے ہسپتال گیا' اس کی لڑکی ایسیا دیہات میں رہتی ہے...... وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھی ذکر کرے...... ہاں' اب اسے بہت کچھ کہنا سننا ہے' جس سے وہ باتیں کرے' اسے چاہئے کہ ٹھنڈی آہیں بھرے' تعجب کا اظہار کرے' اور اس کے سوگ میں شریک ہو...... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں تو اور بھی اچھا ہو' گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں' اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی ہیں۔

''چلیں'' گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں' ایونا سوچتا ہے' سونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے...... نیند کہیں نہیں گئی......

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے' اسے دانے چارے' موسم کا خیال آتا ہے...... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا...... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے...... مگر اس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا' یہ اذیت اس کی برداشت سے باہر ہے۔

''دانہ چبا رہی ہو؟'' اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے۔ ''اچھا جگال کئے جاؤ' کئے جاؤ...... دانے کے لئے کافی مزدوری نہیں ملی تو نہ سہی' گھاس کھا کر گزارہ کر لیں گے...... ہاں...... میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی' اب میرا نہیں' میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا...... وہ پورا گاڑی بان تھا...... اسے کچھ دن اور جینا تھا......''

ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہے' پھر کہتا ہے:

''بیٹی' بات یہ ہے...... کوزما ایونچ چل بسا...... مجھ سے رخصت ہو گیا' بلاوجہ

اچانک جان دے دی......اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھڑا ہے' اور تم اس ننھے سے بچھڑے کی ماں ہو......اور یکا یک وہ بچھڑا مر جائے......تو تمہیں اس کا رنج ہو گا کہ نہیں......؟"

گھوڑی منہ چلاتی ہے' سنتی ہے اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے۔ ایونا کا دل بھر آتا ہے' اور وہ اس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔

چیخوف

متعدد مرض لا علاج ہے۔۔

مرضِ لاعلاج

"آپ سے کہہ دیا کہ میری میز نہ صاف کیا کیجئے" نکولی نے کہا۔ "مجھے کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی' تار کیا ہوا؟ آپ نے اسے کہاں پھینک دیا۔ مہربانی کر کے اس کو تلاش کیجئے۔ کل ہی تو کازن کے پاس سے آیا تھا"۔

ایک دبلی پتلی زرد رنگ کی خادمہ نے میز پر رکھی ہوئی ٹوکری سے متعدد تار نکال کر خاموشی کے ساتھ ڈاکٹر کو دیئے' لیکن یہ سب تار مریضوں کے پاس سے آئے ہوئے تھے' ان میں کازن کا کوئی تار نہ تھا۔ پھر ڈرائنگ روم اور اولگا سریونا کے کمرے میں وہ تار کو تلاش کرتے رہے۔

آدھی رات سے زائد گزر چکی تھی۔ نکولی جانتا تھا کہ اس کی بیوی جلد واپس نہ آئے گی۔ کم از کم پانچ بجے صبح سے پہلے تو وہ آنے سے رہی۔ وہ اس کا اعتبار نہ کرتا تھا۔ جب وہ دیر تک باہر رہتی اسے نیند نہ آتی۔ اسے غصہ آتا تھا۔ اپنی بیوی سے اس کے بستر سے' اس کے آئینے اور اس کی مٹھائی کے ڈبوں سے' اس کے گلدستوں اور پھولوں سے جو روزانہ اس کے دوستوں کی طرف سے تحفتہً اس کے پاس آتے رہتے تھے اور جن سے ایک تکلف آمیز ناگوار خوشبو پھیلتی رہتی تھی۔ اسے نفرت ہو گئی تھی۔ ایسی راتوں کو وہ بدمزہ' چڑچڑا اور بدمزاج ہو جاتا تھا۔ اس وقت اسے ضد سی ہو گئی کہ کسی طرح وہ تار مل جائے حالانکہ اس میں سوائے بڑے دن کی معمولی مبارکباد کے کوئی خاص بات نہ تھی۔

اسے اپنی بیوی کے کمرے میں صندوقچے کے نیچے رکھا ہوا ایک تار ملا...... اسے پڑھنے لگا۔ یہ اس کی بیوی کے نام تھا اور اس کی ساس کے گھر سے بھیجا گیا تھا۔ مانٹی کارلو سے آیا تھا۔ اس پر میکائیل کے دستخط تھے...... ڈاکٹر تار کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا' وہ کسی

دوسری زبان میں تھا شاید انگریزی میں۔

"یہ میکائیل کون ہے؟ اور مانٹی کارلو...... ماں کے توسط سے کیوں بھیجا گیا؟"

اپنی سات سال کی بیاہی زندگی میں وہ شبہات اور بدگمانیوں کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اسے اکثر خیال ہوتا تھا کہ گھر کی مشق کی بدولت وہ ایک کامیاب سراغ رساں ہوسکتا ہے۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر وہ سوچنے لگا۔ سوچتا رہے' اسے یاد آیا کہ ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنی بیوی کے ہمراہ پیٹرس برگ میں تھا اور وہاں اپنے ایک کلاس فیلو انجینئر کے ساتھ اس نے کھانا کھایا تھا۔ اس انجینئر نے اس سے اور اس کی بیوی سے ایک بائیس تئیس سال کے نوجوان کو متعارف کرایا تھا جس کا نام رس تھا۔ دو مہینے بعد ڈاکٹر نے رس کی تصویر اپنی بیوی کے البم میں دیکھی تھی جس کے نیچے فرنچ میں "ایامِ ماضیہ کی یاد اور مستقبل کی اُمید میں" لکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ نوجوان آدمی اسے اپنی ساس کے یہاں ملا۔ اسی زمانہ میں اس کی بیوی گھر سے غائب رہنے لگی تھی اور اکثر راتوں کو چار پانچ بجے صبح سے پہلے واپس نہ آتی تھی۔ وہ سیاحت کی غرض سے باہر جانے کے لئے اپنے شوہر سے پروانہ راہداری دلا دینے کی خواہش کرتی تھی جس کے دلا دینے سے وہ متعدد بار انکار کر چکا تھا غرض گھر میں مستقل بدگمانیاں اور بدمزگیاں رہنے لگی تھیں۔ جس کی شرم سے وہ نوکروں کو منہ دکھانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔

چھ مہینے ہوئے اس کے دوستوں نے اسے بتایا کہ اسے دق ہوگئی ہے اور مشورہ دیا کہ وہ سب کام چھوڑ کر تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کریمیا چلا جائے۔ اس کی بیوی کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے کو بدل دیا۔ اس نے شوہر سے محبت جتانا شروع کی۔ وہ اسے یقین دلاتی رہی کہ کریمیا میں بالکل بےلطفی رہے گی۔ وہاں سردی زیادہ ہوگی اور بہتر ہوگا کہ وہ نائس جائے جہاں وہ اس کے ہمراہ چل کر اس کی تیمارداری کرے گی۔

اب وہ سمجھا کہ اس کی بیوی نائس جانے کے لئے اس قدر کیوں مصر تھی۔ اس کا میکائیل مانٹی کارلو میں رہتا تھا۔

اس نے انگریزی لغت اٹھائی اور الفاظ کا ترجمہ کر کے تار کے مطلب پر غور کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ یہ جملہ بنا لینے میں کامیاب ہوا: "میں اپنی عزیز اولگا کا جامِ صحت نوش

کرتا ہوں اور اس کے چھوٹے نازک پیر کے ہزاروں بوسے لیتا ہوں اور اس کی آمد کا بے چینی سے منتظر ہوں'' نکولی کی نظروں کے سامنے اپنی اس حالت کی تصویر پھر گئی جو اپنی بیوی کے ہمراہ پکڑے جانے میں اس کی ہوتی۔ اسے اتنا رنج ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور مکان کے تمام کمروں میں وہ بے چین ہو کر ٹہلنے لگا۔ اس کا افتخار مجروح تھا' اس کی روح گھٹ رہی تھی۔ اپنی مٹھیاں بند کر کے مایوسانہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے انہیں میز پر مارنا شروع کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ دیہات کے پادری کا بیٹا ہو کر جسے اپنی اعلیٰ مذہبی تعلیم کے ساتھ انتہائی روشن خیالی کے درس دیئے گئے تھے کس طرح ایک ناکارہ' بد ذات اور بے شرم عورت کے پنجوں میں گرفتار ہو گیا تھا' ایک بے بس و مجروح صید کی طرح اس کی خواہشات کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔

''چھوٹے نازک پیر!'' تار کو اپنی مٹھی میں مسلتے ہوئے اس نے کہا۔ ''چھوٹے نازک پیر!''

اس وقت کی یاد جبکہ اسے پہلے پہل اولگا سے محبت ہوئی اور اس نے شادی کے لئے اس کے پاس پیام بھیجا اور اس سات سال کی بیاہی زندگی میں جو اس نے اس کے ساتھ گزاری تھی' جو کچھ اسے یاد رہ گیا تھا' وہ صرف اس کے لانبے' ملائم خوشبودار بال تھے یا اس کے چھوٹے پیر' جو واقعی بہت نازک تھے اور جن سے اس وقت بھی اسے کسی قدر وابستگی تھی......اس کے آگے؟......اس کے آگے کچھ نہیں......یا پھر شبہات' بدگمانیاں' کھوج' مکاری' غصے' دھمکیاں' اعتزار اسے یاد تھا کہ اس کے باپ کے گھر میں کبھی ایک دیہات کی چڑیا کمرے کے اندر آجاتی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش میں وہ شیشہ دار کھڑکیوں سے ٹکرا ٹکرا کر کمرے کی تمام چیزوں میں انتشار اور گڑبڑ پیدا کر دیتی تھی۔ اسی طرح یہ عورت بھی اس کی زندگی کے کمرے میں ایک غیر خاندان سے اُڑ کر چلی آئی تھی اور اس نے اس کے سکون و عافیت میں ابتری پیدا کر رکھی تھی۔ اس کی زندگی کے بہترین ایام گویا جہنم میں گزارے گئے تھے۔ اس کی حوصلہ اور مسرت سے بھری ہوئی امیدیں منہدم ہو گئی تھیں۔ اس کی تندرستی برباد تھی' اس کے کمرے بے ترتیب اور گڑبڑ پیدا کرنے والی فضا میں طوائفوں کے کمروں کا نمونہ تھے۔ اپنی دس ہزار کی سالانہ آمدنی میں سے وہ

اپنی ماں کے لئے جو اپنی ضعیفی کے ایام گاؤں میں کاٹ رہی تھی، دس روبل بھی نہ بچا سکتا تھا۔ اور پندرہ ہزار سے زائد اسکا قرضہ تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کے گھر میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ مستقل طور پر رہتا تو بھی اسے اتنا نقصان نہ پہنچتا' جس قدر بربادی اس نے اس عورت کے ہاتھوں اٹھائی تھی۔

اسے کھانسی آنے لگی اور اس کی سانس پھولنے لگی۔ اس وقت تک اسے بستر پر چلا جانا چاہئے تھا لیکن وہ نہ جا سکا' وہ کمروں میں چہل قدمی کرتا رہا' میز کے پاس بیٹھا رہا۔ ایک چھوٹی پنسل اٹھا کر بغیر الفاظ کو سمجھے ہوئے وہ یہ الفاظ لکھتا رہا:

''چھوٹے نازک پیر!''

پانچ بجے تک وہ کمزور ہو گیا اور سارا الزام اپنے سر لینے لگا۔ اب اس نے سوچا کہ اگر اولگا کی شادی کسی دوسرے شخص سے ہوتی جس کا اس پر کافی اثر ہوتا تو......کون کہہ سکتا ہے؟......وہ ایک پاکباز' باحیا اور شریف عورت رہتی۔ اسے نفسیات پر کافی عبور نہ تھا۔ وہ عورت کے دل سے ناواقف تھا۔ علاوہ اس کے وہ خشک اور غیر دلچسپ تھا......

''میں عرصے تک زندہ نہ رہوں گا'' اس نے خیال کیا۔ ''میں مردہ ہوں مجھے کسی زندہ شخص کی راہ میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں۔ حقوق پر بحث کرنا حماقت ہے۔ میں اب ان جھگڑوں کو ختم کر دوں گا۔ اسے اس کے محبوب کے پاس جانے سے کیوں روکا جائے......میں طلاق دے دوں گا' سارا الزام اپنے سر لے لوں گا''۔

اولگا سریوونا آئی اور مطالعہ کے کمرے میں جا کر جس حالت میں آئی تھی بعینہٖ اسی حالت میں اپنے سفید لبادے' ہیٹ اور بوٹوں میں ملفوف وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بدذات کہیں کا'' اس نے پھولتی ہوئی سانسیں لے کر سسکتے ہوئے کہا۔ ''بے ایمانی کی حد بھی ہے! نفرت ہو گئی'' اس نے اپنے پیر فرش پر پٹخے۔ ''میں اس سے کبھی تو بولوں گی نہیں' نہ ملوں گی' کبھی نہیں!''

چیخوف

تلاش

یہ کوئی چھ سات سال قبل کا قصہ ہے جب میں صوبے ٹی' میں ایک نوجوان جاگیردار بیلوکوروف کے ہاں مقیم تھا' جو علی الصبح بیدار ہونے کے عادی تھے' کسانوں کے جیسا پورے دامنوں والا کوٹ پہنے ادھر ادھر گھومتے' شام کو بیئر پیتے اور برابر شاکی رہتے تھے کہ کہیں بھی کوئی ان سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ وہ خود تو باغ میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جبکہ میں ان کی قدیم حویلی کے ستونوں والے بہت بڑے بال روم میں جہاں فرنیچر کے نام پر بس ایک کشادہ صوفہ رکھا تھا جو میرے پلنگ کا کام دیتا تھا یا پھر ایک میز تھی جس پر میں اکیلا تاش کھیلا کرتا تھا۔ قدیم آتش دانوں میں ہر گھڑی یہاں تک کہ اچھے پرسکون موسم میں بھی آگ سنسناتی رہتی تھی اور برق و باد کے طوفانوں کے دوران ساری حویلی یوں ڈگمگانے لگتی تھی جیسے ابھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کے زمین پر ڈھیر ہو جانے کو ہو۔ عمارت کی یہ حالت طوفانی راتوں میں جبکہ ہال کے دسوں بڑے بڑے دریچے بجلی کے کوندوں سے منور ہو جاتے تھے' خاص طور پر تشویش کا باعث ہوتی تھی۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا میرا مقدر بن چکا تھا' سو میں یہاں بھی کچھ کرتا کراتا نہیں تھا۔ مسلسل کئی کئی گھنٹے دریچے سے آسمان' چڑیوں اور باغ کی روشوں کو دیکھتا رہتا تھا' ڈاک سے میرے لئے جو کچھ آتا تھا اسے پڑھتا رہتا تھا اور سو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں حویلی سے نکل کھڑا ہوتا تھا اور رات گئے تک ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

ایک روز اپنی ان آوارہ گردیوں سے حویلی کو لوٹ رہا تھا تو اتفاقاً میں ایک ایسی جاگیر میں داخل ہو گیا جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شام کے سائے زنگی کے پھولتے ہوئے پودوں پر پھیلتے جا رہے تھے۔ دو قطاروں میں کھڑے ہوئے صنوبر کے پرانے' اونچے اونچے درخت جو ایک دوسرے سے بہت قریب ہونے کی بناء پر تقریباً ٹھوس دیواروں جیسی شکل اختیار کر چکے تھے' ایک نیم تاریک خوبصورت روش کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے چند ریلنگوں کو آسانی سے پار کیا اور اسی روش پر جہاں جمی ہوئی سوئی نما پتیوں کی چار ساڑھے چار سنٹی میٹر اونچی تہہ پر پاؤں پھسل رہے تھے' آگے بڑھنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف درختوں کی پھنگیوں پر مکڑوں کے جالوں میں قوس قزح کی طرح سنہری دھوپ ہلکی ہلکی روشنی بکھیر رہی تھی۔ صنوبر کے درختوں کی مہک نشہ سا طاری کر رہی تھی۔ جلد ہی میں لنڈن کے درختوں کے سائے میں گزرتے ہوئے ایک لمبے راستے پر مڑ گیا۔ یہاں بھی ہر شے سے ویرانی اور قدامت ٹپک رہی تھی۔ پاؤں کے نیچے گزشتہ خزاں کی پتیاں اداسی سے سرسرا رہی تھیں اور درختوں کے تنوں کے درمیان شام کے جھٹ پٹے میں پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ پر پھلوں کے ایک بہت ہی پرانے باغ میں اوریول چڑیا بڑی ناتوانی کے ساتھ بول رہی تھی اور ہر شے کی طرح وہ بھی غالباً بوڑھی تھی۔ پھر لنڈن درختوں کا سلسلہ برآمدے اور دو رویہ' ہر رخ پر ڈھالوں والی چھت کی ایک قدیم عمارت کے سامنے ختم ہو گیا۔ اچانک مجھے جاگیردار کے مکان کا احاطہ نظر آیا' ایک بڑا سا تالاب نظر آیا جس کے کنارے غسل کرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی' بید کے بے ترتیبی سے لگے ہوئے ہرے بھرے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا اور تالاب کی دوسری جانب واقع گاؤں کے بیچ میں گرجے کا بلند اور تنگ گھنٹہ گھر جس کی چوٹی کی صلیب کو آفتاب کی آخری شعاعیں جگمگا رہی تھیں۔ پل بھر کے لئے مجھ پر کسی مانوس فضا نے جس سے میں برسوں سے واقف رہا ہوں جادو سا کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ان تمام مناظر کو کبھی پہلے بھی اپنے بچپن ہی میں دیکھ چکا ہوں۔

احاطے کے باہری پھاٹک پر جو کھیتوں کی طرف کھلتا تھا اور جس کے سفید پتھر کے

دونوں مضبوط ستونوں پر شیر بنے ہوئے تھے' دو لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ چھریرا بدن' پیلی رنگت' سنہرے بالوں کا سر کے اوپر بڑا سا جوڑا اور انتہائی حسین وجمیل۔ یہ تھی بڑی لڑکی۔ منہ البتہ چھوٹا اور مغرور سا تھا' سخت مزاج بھی لگتی تھی اور اس نے میرے وجود کو عدم وجود ہی تصور کیا۔ دوسری لڑکی مشکل سے کوئی سترہ اٹھارہ برس ہی کی رہی ہو گی' اس کی بھی رنگت پیلی اور بدن چھریرا ہی تھا لیکن منہ ذرا کشادہ تھا' شرمیلی معلوم ہوتی تھی۔ اور حیرت سے کھلی ہوئی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں سامنے سے گزرا تو اس نے انگریزی میں دو ایک الفاظ بھی ادا کئے لیکن جھجھک سی گئی۔ اور مجھے ایسا لگا کہ میں ان دونوں خوبصورت چہروں سے بھی برسوں قبل واقف رہ چکا ہوں۔ بہرحال میں اپنی پرانی حویلی کو یہ احساس لئے ہوئے لوٹا کہ کوئی پرمسرت خواب دیکھا ہے۔ چند دنوں کے بعد ایک سہ پہر کو جبکہ میں بیلوکوروف کے ساتھ حویلی کے سامنے ٹہل رہا تھا' احاطے میں داخل ہونے والی ایک بگھی کے پہیوں تلے لمبی لمبی گھاس سرسرانے لگی۔ اس پر انہی دونوں لڑکیوں میں سے ایک' بڑی والی سوار تھی۔ وہ آتش زدگی سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے چندے کی فہرست لے کر ہمارے ہاں آئی تھی۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھے بغیر بغیر سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ سیانوو گاؤں میں کتنے گھر جل کر خاک ہو گئے ہیں' کتنے مردوں' عورتوں اور بچوں کے لئے سر چھپانے کی جگہ باقی نہیں رہی اور امدادی کمیٹی جس کی وہ بھی ایک رکن تھی' مصیبت زدہ افراد کی بحالی کے لئے عارضی طور پر کون کون سے اقدام کرنا چاہتی ہے۔ فہرست کو ہم دونوں سے دستخط کرا کے اس نے اپنے پاس رکھ لیا اور فوراً ہی رخصت چاہی۔

''آپ نے تو ہم لوگوں کو بالکل فراموش ہی کر دیا' ''پیوتر پیترووچ'' اس نے بیلوکوروف کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے ان سے کہا۔ ''کسی روز ہمارے ہاں تشریف لائیے نا! اور اگر میسواین (اس نے میرا نام لیا) اپنے کچھ مداحوں سے متعارف ہونا پسند فرمائیں تو میری والدہ کو اور مجھے ان کا خیر مقدم کر کے دلی مسرت ہو گی''۔

میں نے اخلاقاً سر جھکا لیا۔

وہ چلی گئی تو پیوتر پیترووچ مجھے اس کے بارے میں بتانے لگے۔ انہوں نے کہا

کہ لڑکی اچھے خاندان کی ہے' نام ہے لیدیا دولچانینووا اور جاگیر جس پر وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رہتی ہے اور تالاب کے دوسرے کنارے والا گاؤں دونوں شیلکوفکا کہلاتے ہیں۔ اس کے والد ماسکو میں کسی بڑے عہدے پر مامور تھے اور انتقال کے وقت ان کا مرتبہ شاہی مشاورتی کونسل کے ممبر کے جیسا تھا۔ خاندان کے مالی حالات بہت اچھے ہونے کے باوجود تینوں ہمیشہ دیہات ہی میں رہتی تھیں' لیدیا اپنے گاؤں شیلکوفکا میں' زیمستوو کی طرف سے قائم اسکول میں پڑھاتی اور پچیس روبل ماہانہ تنخواہ پاتی تھی۔ اپنے ذاتی مصارف وہ اسی تنخواہ ہی سے پورے کر لیتی تھی اور اسے فخر تھا کہ وہ کسی کے اوپر بار نہیں ہے۔

''بہت دلچسپ خاندان ہے'' بیلوروف نے کہا۔ ''کسی روز ہمیں ان کے ہاں چلنا چاہئے۔ ان سے مل کر انہیں بہت خوشی ہوگی''۔

یہ کسی مقدس بزرگ کی یاد منانے کا دن تھا جب ہمیں ڈنر کے بعد وولچانینوف خاندان کی یاد آئی اور ہم شیلکوفکا کے لئے روانہ ہو گئے۔ ماں اور دونوں بیٹیاں گھر ہی پر تھیں۔ ماں یکاتیرینا پاولوونا کسی زمانے میں شاید خاصی خوبصورت رہی ہو گی لیکن اب اپنی عمر کے اعتبار سے ذرا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی موٹی ہو گئی تھیں' سانس پھولتی تھی اور اداس اور کھوئی سی نظر آتی تھیں۔ وہ بیٹی سے یہ سننے کے بعد کہ میرے شیلکوفکا آنے کا امکان ہے' میری بنائی ہوئی مناظر فطرت کی دو تین تصویروں کی جو انہوں نے ماسکو کی نمائشوں میں دیکھی تھیں' یاد تازہ کر چکی تھیں اور اب پوچھنے لگیں کہ میں ان کے ذریعے کن خیالات اور جذبات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ لیدیا یا جیسا کہ وہ گھر میں کہی جاتی تھی' لیدا زیادہ باتیں مجھ سے نہیں بلکہ بیلوکوروف سے ہی کر رہی تھی۔ اس نے اپنے سنجیدہ چہرے پر خفیف سی بھی مسکراہٹ لائے بغیر ان سے پوچھا کہ آخر وہ زیمستوو سے بالکل قطع تعلق کیوں کئے ہوئے ہیں' کبھی اس کے ایک جلسے تک میں شریک کیوں نہیں ہوئے۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے' پیوتر پیترووچ'' اس نے سرزنش بھرے لہجے میں کہا۔ ''واقعہ یہ اچھی بات نہیں' آپ کو شرم آنی چاہئے''۔

''سچ کہہ رہی ہو لیدا' بالکل سچ'' ماں نے تائید کی۔ ''یہ اچھی بات نہیں''۔

''ہمارا سارے کا سارا ضلع یوں سمجھئے کہ بالاگین ہی کی مٹھی میں ہے'' لیدا نے مجھ سے مخاطب ہو کے بات جاری رکھی۔ ''وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین ہیں' ضلع کی ساری خاص خاص جگہوں پر اپنے بھتیجوں' دامادوں کو بٹھا رکھا ہے اور ٹھاٹ سے من مانی کرتے ہیں۔ ہمیں ان سے ٹکر لینی چاہیئے۔ ہم نوجوان افراد کو طاقتور گروہ کی شکل اختیار کر لینی چاہیئے' پر نوجوان افراد جیسے ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ شرمناک بات ہے' پیوتر پیترووچ!''

چھوٹی بہن ژینیا جب تک زیمستوو کا قصہ چھڑا رہا' خاموش رہی۔ سنجیدہ گفتگو میں اس کے زبان ہلانے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا تھا' وہ تو گھر میں ابھی تک بچی ہی سمجھی جاتی تھی' ابھی تک اسی پیار کے نام میسوس ہی سے مخاطب کی جاتی تھی جو بچپن میں اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ اپنی معلّمہ کو مس کے بجائے میسوس کہا کرتی تھی۔ وہ مجھے تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور خاندانی البم کے جس کو میں دیکھ رہا تھا' فوٹوؤں کے متعلق تفصیلات فراہم کرتی جاتی تھی۔ ''یہ میرے چچا ہیں...... یہ دینی والد ہیں'' اس نے فوٹوؤں کو چھوتے ہوئے کہا اور اپنی معصومیت میں اتنی قریب آ گئی کہ اس کا شانہ میرے شانے سے رگڑ کھا گیا۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے سینے' نازک شانے' بالوں کی چوٹی اور کمر پر پیٹی سے کسا ہوا سارا دبلا پتلا جسم میری آنکھوں کے عین سامنے تھا۔

ہم لوگ کروکے اور لان ٹینس کھیلتے رہے' باغ میں گھومتے پھرتے چائے پی اور پھر شام کے کھانے پر کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ مجھے ستونوں والے اس بہت بڑے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے ہال روم کے بعد اس چھوٹے سے آرام دہ گھر میں جہاں دیواروں پر روغنی تصاویر آویزاں نہ تھیں اور جہاں نوکروں کو ''تو'' کے بجائے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا' بڑا سکون ملا۔ لیدا اور میسوس کی موجودگی ماحول کو پاکیزگی اور تازگی عطا کر رہی تھی اور ہر شے سے دیانت داری ٹپکتی تھی۔ کھانے پر لیدا نے بیلوکوروف سے باتیں چھیڑیں تو ایک بار پھر وہی زیمستوو' بالاگین اور اسکول لائبریریوں کا قصہ لے بیٹھی۔ پرجوش' مخلص اور اپنے خیالات پر سختی سے قائم رہنے والی یہ لڑکی تھی تو

بڑی خوش گفتار لیکن بولتی بہت تھی اور وہ بھی زور زور سے۔ شاید اس لئے کہ وہ پوری پوری کلاسوں سے خطاب کرنے کی عادی تھی۔ ان کے برعکس میرے دوست پیوتر پترووچ اب بھی اپنی طالب علمی کے زمانے کی عادت' ہر گفتگو کو بحث کا انداز دے دینے کی عادت ہی سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ بے جان اکتا دینے والی لمبی لمبی دلیلیں پیش کر رہے تھے جن کا مقصد جیسا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا' محض یہ دکھانا تھا کہ وہ ذہانت اور ترقی پسند خیالات کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایک بار انہوں نے کسی بات پر زور دینے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ان کے کف سے ٹکرا کر چٹنی کی کشتی لڑکھڑائی اور میز پوش پر بڑا سا دھبا پڑ گیا لیکن اسے میرے سوا اور کسی نے جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تو چاروں طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔

شائستگی صرف میز پر چٹنی نہ گرانے ہی کو نہیں بلکہ اس کو بھی کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا گرا دے تو اس پر دھیان نہ دیا جائے۔ بیلوکوروف نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ہاں بھئی! یہ بڑا شریف اور مہذب خاندان ہے۔ شرفاء سے میرا ناتا ہی ٹوٹ چکا ہے میری حالت خاصی بگڑ چکی ہے اور کتنے کام کرنے کو باقی ہیں کتنے کام!''

پھر وہ مجھے بتانے لگے کہ انسان مثالی زمیندار ہونا چاہیے تو اسے کیا کیا کرنا چاہیے اور میں سوچنے لگا کہ کتنے کاہل اور ناقابل اصلاح شخص ہیں یہ بھی! کسی سنجیدہ مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے وقت زور دینے کے لئے ہمیشہ بیچ بیچ میں وہ جس طرح ''ار......ار'' کی آواز نکالتے تھے وہ بڑی بُری معلوم ہوتی تھی اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے کے انداز ہی میں مختلف کاموں میں بہت دیر لگاتے تھے۔ کسی کام کو وقت پر پورا کر لینا تو جیسے انہیں آتا ہی نہیں تھا۔ میرے خیال میں وہ ذرا بھی عملی آدمی نہ تھے' جس کا یہ ثبوت ہی کیا کم تھا کہ کبھی میں انہیں ڈاک میں ڈالنے کے لئے خطوط دیتا تو ہفتوں جیب ہی میں دبائے رہتے تھے۔

''اور بدترین بات یہ ہے'' انہوں نے میرے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہا۔ ''کہ......آپ کام کرتے رہیے' کرتے رہیے' اور آپ سے کوئی بھی ہمدردی ظاہر نہیں

کرتا۔ ذرا سی بھی ہمدردی نہیں!''

پھر ایسا ہوا کہ مجھے دولچانینوف خاندان سے ملنے کے لئے جانے کی عادت سی پڑ گئی۔ وہاں میں عموماً برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھا کرتا تھا۔ تاسف کا احساس میرے لئے وبالِ جان بنا رہتا تھا' اپنی بے مقصد تیزی سے گزرتی ہوئی زندگی کو کوستا اور برابر سوچتا رہتا تھا کہ اپنے دل کو جو بارِ گراں بن چکا ہے' کسی طرح سینے سے نوچ کے پھینک سکوں تو کتنی اچھی بات ہو۔ اور اس دوران برآمدے میں مسلسل باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ خواتین کے سایوں کی سرسراہٹیں اُبھرتی رہتی تھیں اور اوراق اُلٹنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جلدی میں لیدا کے بارے میں اس واقفیت کا عادی ہو گیا کہ وہ مریضوں کو دیکھتی ہے' لوگوں کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتی ہے' دن کے وقت برہنہ سر پر چھتری لگا کر اکثر گاؤں کو جاتی اور شام کو اونچی آواز سے زیمستوو اور اسکولوں کے متعلق باتیں کرتی ہے۔ چھریرے بدن کی یہ حسین و جمیل لیکن سخت مزاج لڑکی عملی معاملات پر اظہارِ خیال کے لئے اپنے چھوٹے سے خوبصورت منہ کو کھولتی تو ہمیشہ ہی تمہید کے طور پر سرد مہری کے ساتھ مجھ سے یہ ضرور کہتی تھی:

''اس سے آپ کو دلچسپی نہ ہوگی''۔

مجھے وہ پسند کرتی تھی' اس لئے بھی کہ میں مناظر فطرت کا مصور تھا اور اپنی تصویروں میں عوامی ضروریات کی ترجمانی کی کوشش نہیں کرتا تھا اور اس لئے بھی کہ جن خیالات پر وہ سختی سے قائم تھی ان کی مجھے خاک بھی پروا نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بیکال جھیل کے کنارے کنارے گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا تو اتفاق ایک بوریات لڑکی سے ملاقات ہو گئی جو قمیض اور موٹے سوتی کپڑے کا پاجامہ پہنے گھوڑے پر گزر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا پائپ میرے ہاتھ فروخت کر دے تو جواب میں اس نے میری یورپی وضع قطع اور ہیئت پر صرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی' اسے پل بھر سے زیادہ مجھ سے بات کرنا وبالِ جان معلوم ہوا اور زور سے ہو ہو کی آواز نکالتی گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور لیدا کو بھی مجھ میں ایک طرح کی اجنبیت کا احساس ہوتا تھا۔ اپنی

ناپسندیدگی کا وہ کسی طرح اظہار تو نہیں کرتی تھی' پھر بھی میں اس کے جذبات کو محسوس کر رہا تھا اور کبھی کبھی اس نچلی سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے جھلاہٹ میں اس سے کہہ بھی دیتا تھا کہ جو شخص ڈاکٹر نہ ہو' اس کا کسانوں کا علاج کرنا محض ڈھونگ ہے اور جب کسی کے پاس اتنی بڑی جاگیر ہو تو اس کے لئے خیرات کے طور پر کچھ نکال دینا بہت آسان ہوتا ہے۔

لیکن اس کی بہن میسوس ان سارے چکروں اور فکروں سے بالکل بے تعلق تھی اور میری ہی طرح کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ صبح کو بیدار ہوتے ہی وہ مطالعے میں مصروف ہو جاتی تھی' کبھی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر جس سے اس کے پاؤں بمشکل ہی فرش تک پہنچتے تھے اور کبھی لنڈن کے درختوں والی روشن تنہائی میں۔ کبھی کبھی وہ پھاٹک سے نکل کے کھیتوں کی طرف بھی چلی جاتی تھی۔ مطالعے کا یہ سلسلہ وہ سارے سارے دن بڑے اشتیاق و انہماک سے جاری رکھتی تھی اور صرف کبھی کبھی ہی اس کی تھکی تھکی نگاہوں اور چہرے کی گہری زردی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مطالعے سے ذہن پر بار پڑ رہا ہے۔ میں ان لوگوں کے یہاں پہنچتا اور وہ مجھے دیکھتی تو اس کے چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی چھا جاتی' جلدی سے کتاب ایک طرف رکھ کے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیتی اور گزشتہ اور تازہ ملاقات کے درمیان جو واقعات بھی پیش آئے ہوتے' بیان کرنے لگتی مثلاً یہ کہ نوکروں کی رہائش گاہ کی چمنی میں آگ لگ گئی تھی' تالاب میں ایک مزدور نے بہت بڑی مچھلی پکڑی تھی اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ اتوار کے سوا ہفتے کے باقی دنوں میں وہ عموماً رنگین بلاؤز اور گہرے نیلے رنگ کا سایا پہنا کرتی تھی۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے' مربے کے لئے آلوچے توڑتے یا کشتی چلاتے اور جب کبھی وہ آلوچے توڑنے کے لئے اچھلتی یا چپوؤں پر جھکتی تو اس کی چوڑی چوڑی آستینوں کے اندر نازک نازک بانہیں دکھائی دینے لگتیں۔ کبھی کبھی میں کوئی خاکہ بنانے بیٹھ جاتا اور وہ میرے پاس کھڑی ہو کے پرستائش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہتی۔

جولائی کے آخری ایام میں اتوار کے دن میں نو بجے صبح ہی وولچانینوف خاندان کے ہاں جانے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ میں گھر سے حتی الامکان دور رہتے ہوئے پارک میں ٹہل ٹہل کر جہاں جہاں سانپ چھتریاں نظر آئیں وہاں وہاں میں نے ٹہنیاں گاڑ

کے نشانات بنا دیئے تا کہ میں بعد میں ژینیا کے ساتھ انہیں توڑ سکوں۔ گرم ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ژینیا اور اس کی ماں دونوں اتوار کے ہلکے رنگ کے لباس زیب تن کئے گرجے سے گھر لوٹ رہی ہیں۔ ژینیا اپنے ہیٹ کو پکڑے ہوئے تھی تا کہ ہوا میں اُڑ نہ جائے۔ پھر تھوڑی دیر بعد مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جن سے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ برآمدے میں بیٹھی چائے پی رہی ہیں۔

میرے جیسے بے فکر شخص کے لئے جو ہمیشہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کے بہانوں ہی کی تلاش میں رہتا ہو' ہماری دیہی جاگیروں پر گرمیوں میں اتوار کی یہ صبحیں اپنے اندر بلا کی دلکشی رکھتی ہیں۔ جب سرسبز و شاداب اور شبنم کے موتیوں سے آراستہ باغ آفتاب کی شعاعوں سے منور اور مسرور ہوتا ہے' جب گھر کے قریب پھولوں کی کیاریوں سے چاروں طرف لطیف خوشبوئیں بکھری ہوتی ہیں' جب گرجے سے ابھی ابھی واپس لوٹے ہوئے نوجوان افراد باغ میں بیٹھے چائے نوشی کر رہے ہوتے ہیں' ہر شخص انتہائی خوش و خرم اور انتہائی دلکش کپڑوں میں ملبوس ہوتا ہے اور جب میں خود کو یاد دلاتا ہوں کہ یہ توانا و تندرست' یہ خوبصورت افراد اپنی ساری زندگی میں کبھی کچھ بھی نہ کریں گے تو میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ زندگی ہمیشہ بس ایسی ہی رہے۔ اس روز صبح کو بھی میں باغ میں ٹہلتے ٹہلتے انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا اور اسی طرح بے مقصد' کسی کام سے سروکار رکھے بغیر دن بھر' گرمیوں بھر ٹہلتے رہنے کو تیار تھا۔

اتنے میں ژینیا ایک ٹوکری لئے ہوئے نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے کی کیفیت کہہ رہی تھی کہ اسے معلوم تھا یا احساس ہو گیا تھا کہ باغ میں مجھ سے ملاقات ہو گی۔ ہم دونوں سانپ چھتریاں چنتے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ جب کوئی بات پوچھتی تو میرے سامنے آجاتی تھی تا کہ میرے چہرے کو دیکھ سکے۔

"کل گاؤں میں ایک معجزہ ہو گیا" اس نے کہا۔ "لنگڑی پیلاگیا کوئی سال بھر سے بیمار تھی۔ نہ کسی ڈاکٹر کے مشورے کا اثر ہوتا تھا نہ کسی دوا کا۔ کل ایک جادوگرنی نے چپکے چپکے کوئی منتر پڑھا اور وہ اچھی ہو گئی"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی" میں نے کہا۔ "ہمیں معجزوں کی تلاش صرف اسی وقت نہ

ہونی چاہئے جب لوگ علیل ہوں یا سن رسیدہ ہو چکے ہوں۔ کیا صحت بجائے خود ایک معجزہ نہیں ہے؟ اور زندگی؟ ہر وہ شے جسے ہم نہیں سمجھتے معجزہ ہی تو ہے"۔

"اور جو چیزیں آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں کیا ان سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں...... جو عجیب و غریب چیزیں میری سمجھ میں نہیں آتیں' ان کے قریب میں بڑی دلیری کے ساتھ جاتا ہوں' ان سے مغلوب نہیں ہوتا۔ میں ان سے بلند ہوں۔ انسان کو چاہئے کہ خود کو شیر ببر سے' شیر سے' ستاروں سے' ساری قدرت سے حتیٰ کہ ان چیزوں سے بھی بلند تر تصور کرے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور جنہیں ہم معجزے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ انسان نہیں بلکہ ہر چیز سے ڈرنے والا چوہا ہے"۔

ژینیا نے فرض کر لیا تھا کہ چونکہ میں مصور ہوں' اس لئے میری معلومات کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور جو کچھ مجھے نہیں معلوم اسے بھی قیاس سے بالکل صحیح طور پر جان سکتا ہوں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے اُڑا کے کسی جاوداں اور خوبصورت فضا میں' اس بلند تر دنیا میں لے جاؤں جس سے اس کے یقین کے بموجب میں پوری طرح مانوس تھا اور وہ مجھ سے خدا کے متعلق' حیاتِ ابدی اور معجزوں کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ میں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ موت کے ساتھ ہی میں اور میرا تخیل دونوں بالکل فنا ہو جائیں گے' اس لئے اس کو جوابات دیتا رہا: "ہاں ہاں! انسان جاوداں ہے" "ہاں ہاں! حیاتِ ابدی ہماری منتظر ہے"۔ وہ میری اس قسم کی باتوں کو سنتی اور ثبوت مانگے بغیر ان پر یقین کرتی رہی۔

ہم گھر لوٹ رہے تھے تو اس نے اچانک ٹھہر کے پوچھا:

"میری لیدا بہن بڑی شاندار ہیں نا؟ میں تو انہیں پوجتی ہوں اور ان کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہوں۔ لیکن آپ......" ژینیا نے میرے کوٹ کی آستین پر اپنی ایک انگلی رکھ دی۔ "آپ آخر ان سے ہر وقت بحث کیوں کرتے رہتے ہیں؟ اتنے تنک مزاج کیوں ہیں آپ؟"

"کیونکہ وہ غلطی پر ہیں"۔

ژینیا نے میری اس رائے پر اظہارِ ناپسندیدگی کرتے ہوئے سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپ کی اس بات کو سمجھنا کتنا مشکل ہے!" اس نے کہا۔

اس وقت لیدا جو کہیں سے واپس لوٹی تھی، گھڑسواری کا کوڑا ہاتھ میں لئے برساتی کے پاس کھڑی۔ نازک اندام، حسین و جمیل، آفتاب کی شعاعوں سے چمکتی ہوئی، کسی مزدور کو ہدایات دے رہی تھی۔ اس نے زور زور سے باتیں کرتے ہوئے جلدی جلدی، دو تین مریضوں کو دیکھا اور پھر بہت مصروف اور کھوئی کھوئی سی ہونے کا تاثر دیتی ہوئی ایک کمرے سے دوسرے میں جاتی اور مختلف الماریوں کو کھولتی رہی جس کے بعد بالائی منزل پر چلی گئی۔ اسے دوپہر کے کھانے پر بلانے کے لئے کافی دیر تک تلاش کیا گیا اور آخرکار جب وہ آئی تو ہم لوگ اپنے سوپ ختم کر چکے تھے۔ جانے کیوں میں ان چھوٹی چھوٹی کو باتوں کو بڑی جذباتیت کے ساتھ یاد کر رہا ہوں، جانے کیوں اس دن سے متعلق میری یادیں بڑی رنگین ہیں، اس دن تو کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ لنچ کے بعد ژایانیا گہری آرام کرسی پر نیم وا ہو کے مطالعہ کرنے لگی اور میں برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں بالکل خاموش رہے۔ آسمان ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ فضا گرم تھی، ہوائیں بہت پہلے ہی تھم چکی تھیں اور لگتا تھا کہ یہ دن ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ آخرکار یکاتیرینا پولوونا جن کی آنکھیں اب بھی نیند سے بوجھل تھیں، ہاتھ میں پنکھا لئے برآمد میں آئیں۔

"ارے ممی!" ژینیا نے ان کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ "دن میں سونا آپ کے لئے مضر ہے!"

یہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے پر جان چھڑکتی تھیں۔ ایک کے باغ میں چلے جانے پر دوسری کا برآمدے میں نمودار ہو کر درختوں کے تنوں کے درمیان نظریں دوڑاتے ہوئے پکارنا یقینی ہوتا تھا: "ارے ژینیا!" یا "ارے ممی! آپ کہاں ہیں؟" دونوں یکساں طور پر دین دار تھیں اور ساتھ ساتھ عبادت کرتی تھیں۔ انہیں کچھ کہے سنے بغیر ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھنا خوب آتا تھا۔ دوسروں کے متعلق ان

کی آراء بھی یکساں ہی ہوا کرتی تھیں۔ یکا تیرینایا ولودنا کو جلد ہی مجھ سے بھی گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ میں دو تین روز ان کے ہاں نہ جاتا تو کسی کو یہ معلوم کرنے کے لئے ہمارے ہاں بھیجتیں کہ میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ میرے خاکوں کو وہ بھی پرستائش نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور ان کے ہاں جو کچھ واقعات بھی پیش آتے تھے' ان کی تفصیلات میسوس ہی کی جیسی بے تکلفی اور صاف گوئی سے مجھے بتا دیتی تھیں۔ یہی نہیں' وہ تو اکثر گھریلو معاملات میں بھی مجھے اپنا ہم راز بنا لیتی تھیں۔

بیچاری اپنی بڑی بیٹی سے البتہ ڈری سہمی سی رہتی تھیں۔ لیدا کے طور طریقے زیادہ پیار محبت والے نہ تھے' وہ صرف سنجیدہ اُمور کے متعلق ہی باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ الگ تھلگ اپنی مخصوص دنیا میں کھوئی رہتی تھی اور ماں اور چھوٹی بہن کے لئے مقدس اور کسی حد تک پراسرار شخصیت تھی جیسے کہ اپنے کیبن تک محدود امیر البحر جہاز کے ملاحوں کے لئے ہوتا ہے۔

''ہماری لیدا بڑی عمدہ شخصیت کی مالک ہے'' یکا تیرینایا ولودنا اکثر کہتی رہتی تھیں: ''ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

اور اس وقت بھی جبکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی' لیدا ہی کا ذکر چھڑ گیا۔

''بڑی شاندار لڑکی ہے'' ماں نے کہا اور پھر سہمے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کوئی خفیہ بات کہنے کی جیسی دبی دبی آواز میں اضافہ کیا: ''اس جیسی لڑکیاں بس چند ہی ہوں گی لیکن آپ سے کیا چھپانا' مجھے ذرا تشویش سی ہو چلی ہے۔ اسکولوں' ڈسپنسریوں اور کتابوں کا معاملہ اپنی جگہ پر بہت خوب سہی' پر بھئی انتہا پسندی سے کیوں کام لیا جائے؟ عمر کے چوبیس سال پورے ہونے کو ہیں' اسے تو اب اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ کتابیں اور ڈسپنسریاں تو آنکھوں پر ایسے پردے ڈالتی ہیں کہ انسان کو وقت کی تیز رفتاری کا احساس ہی نہیں ہوتا...... وقت آ گیا ہے کہ اس کی شادی ہو''۔

ژینیا نے جس کا چہرہ مطالعے کی تھکن سے زرد پڑ چکا تھا اور بال اُلجھے ہوئے تھے' سر اٹھایا اور اپنے آپ سے مخاطب ہونے کے انداز میں لیکن ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ہم سبھی پروردگار کی مرضی کے تابع ہیں' ممی!''

اور وہ ایک بار پھر اپنی کتاب میں کھوگئی۔

اتنے میں بیلوکوروف آ گئے' کڑھی ہوئی قمیض اور وہی کسانوں کے جیسا کوٹ پہنے ہوئے۔ ہم لوگ کروکے اور لان ٹینس کھیلتے رہے۔ اندھیرا چھا گیا تو ہم سب رات کے کھانے کی میز پر بہت دیر تک بیٹھے رہے اور لیدا اسکولوں اور اسی بالاگین کا رونا روتی رہی جس کی مٹھی میں سارا ضلع تھا۔ اس شام کو میں وولچانینوف خاندان کے ہاں سے یہ تاثر لے کے اٹھا کہ بیکاری کا یہ دن طویل' کتنا طویل تھا اور میں نے بڑی اداسی کے ساتھ سوچا کہ دنیا میں سب کچھ خواہ وہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو' بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ ژینیا ہمیں رخصت کرنے کے لئے پھاٹک تک آئی اور شاید اس وجہ سے کہ میں نے صبح سے شام تک پورا دن اس کے ساتھ گزارا تھا' مجھے احساس ہونے لگا کہ ژینیا کے بغیر تنہائی میرے لئے کتنی وبال جان ہوگی' نیز یہ کہ یہ پورا دلکش خاندان مجھے کتنا زیادہ عزیز ہے۔ اور اس موسم گرما میں پہلی بار میرے دل میں کسی تصویر کی تخلیق کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔

''بھلا آپ کی زندگی بے کیف اور بے رنگ کیوں ہے؟'' راستے میں بیلوکوروف سے میں نے پوچھا۔ ''میری زندگی بے کیف' بے رنگ اور اکتا دینے والی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں مصور ہوں' دربدر مارا مارا پھرتا ہوں' اپنی نوجوانی کے آغاز ہی سے رشک' تاسف اور خود اپنے کام پر بے اعتمادی کی آگ میں جلتا رہا ہوں۔ میں تو ہمیشہ ہی قلاش رہوں گا' آوارہ گرد جو ٹھہرا۔ لیکن آپ...... آپ تو ایک عام صحت مند آدمی ہیں' جاگیردار ہیں' مہذب آدمی ہیں' آخر آپ کی زندگی اتنی بے لطف کیوں ہے؟ آخر آپ کو زندگی سے کچھ حاصل کیوں نہیں ہوتا؟ مثال کے طور پر آپ کے لیدا یا ژینیا کی محبت میں مبتلا ہو جانے میں کون سی رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے؟''

''آپ بھول رہے ہیں کہ میں کسی دوسری عورت سے محبت کرتا ہوں'' بیلوکوروف نے جواب دیا۔

میں جانتا تھا کہ ان کی مراد لیوبوف ایوانوونا ہے' ان خاتون سے تھی جن کے ساتھ

وہ باغ والے چھوٹے گھر میں رہتے تھے۔ انہیں تو میں روز ہی باغ میں گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا۔ فربہ اندام، پھولے پھولے گال، متکبر، کسی موٹی تگڑی بطخ سے مشابہ، جسم پر روسی قومی لباس اور دانوں کے نیکلس اور ہاتھ میں ہمیشہ کھلی ہوئی چھتری۔ انہیں کھانے اور چائے پر بلانے کے لئے نوکر کو ہمیشہ ہی آواز دینی پڑتی تھی۔ انہوں نے کوئی تین سال قبل گرمیاں گزارنے کے لئے اس گھر کو کرائے پر لیا تھا، اس میں بیلوکروف کے ساتھ ٹھہر گئی تھیں اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ باقی زندگی یہیں گزارنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ عمر میں تو وہ بیلوکوروف سے تقریباً دس سال بڑی تھیں، لیکن ان پر کچھ اس طرح حاوی ہو گئی تھیں کہ بیلوکوروف ان سے اجازت لے کر ہی کہیں باہر جا سکتے تھے۔ وہ اکثر بھرائی ہوئی مردنی آواز سے رویا بھی کرتی تھیں اور جب میں کسی کو بھیج کر دھمکی دیتا کہ خاموش نہ ہوئیں تو میں اپنا کمرہ خالی کر دوں گا، تب کہیں جا کر ان کی یہ سسکیاں بند ہوتیں۔

حویلی میں پہنچ کر بیلوکوروف میرے صوفے پر بیٹھ گئے اور بھویں سکیڑ کر جانے کیا سوچنے لگے۔ میں کمرے میں کچھ ایسی لطیف خلش کے ساتھ ٹہلنے لگا جیسے واقعی محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وولچانینوف خاندان ہی کے متعلق باتیں کرتا رہوں۔

''لیدا تو زیمستوو کے کسی ممبر ہی سے، ایسے ہی کسی شخص سے محبت کر سکتی ہیں جو خود انہی کی طرح اسپتالوں اور اسکولوں سے گہری دلچسپی رکھتا ہو'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایسی حسین و جمیل لڑکی کے لیے زیمستوو کی ممبری تو کیا آدمی پریوں کی کہانی کے عاشق کی طرح لوہے کے جوتے پہننے پر بھی تیار ہو سکتا ہے اور میسوس؟ کتنی پیاری ہیں میسوس بھی!''

بیلوکوروف نے بار بار ''ار، ار'' کی آواز نکالتے ہوئے ہمارے عہد کی بیماری قنوطیت پر طویل تقریر شروع کر دی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کر رہے تھے اور ان کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا گویا میں نے ان سے بحث چھیڑ رکھی ہو۔ کوئی بے کراں، یک رنگ، دھوپ سے جھلسا ہوا میدان بھی اتنا غیر دلچسپ نہیں ہوتا جتنا وہ ایک شخص جو آپ کے کمرے میں بیٹھا ہوا یوں مسلسل باتیں کرتا رہے جیسے کبھی خاموش ہی نہ ہو

گا۔

''سوال قنوطیت یا رجائیت کا نہیں ہے'' میں نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ننانوے فیصدی لوگ عقل سے خالی ہیں''۔

بیلوکوروف نے اس چوٹ کو ذاتی توہین تصور کیا اور بھنا کے چل دیئے۔

''کنیاز ملاز یموو میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور انہوں نے آپ کو سلام کہا ہے'' لیدا نے اپنی ماں کو بتایا۔ وہ ابھی ابھی کہیں سے واپس لوٹی تھی اور دستانے اتار رہی تھی۔ ''انہوں نے بڑی دلچسپ باتیں کیں' وعدہ کیا کہ کونسل کے اگلے جلسے میں ملاز یموو میں پھر سے ایک طبی امداد کے مرکز کے قیام کا مسئلہ اٹھائیں گے۔ پھر اس میں کامیابی کی امید انہیں کم ہی ہے'' اور اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''معاف کیجئے گا' میں برابر بھولتی رہتی ہوں کہ یہ سب باتیں آپ کے لئے زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتیں''۔

مجھے سخت جھلاہٹ محسوس ہوئی۔

''آخر کیوں نہیں؟'' میں نے شانے اچکاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو میری رائے جاننے کی کبھی پرواہی نہیں ہوتی لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس مسئلے سے گہری دلچسپی ہے''۔

''واقعی؟''

''جی ہاں! میرے خیال میں ملاز یموو میں کسی طبی امداد کے مرکز کی ضرورت نہیں''۔

میری جیسی جھلاہٹ اب لیدا پر طاری ہوگئی۔ اس نے بھینچی بھینچی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا:

''تو پھر کا ہے کی ضرورت ہے' مناظر فطرت کی تصویروں کی؟''

''نہیں! ان تصویروں کی بھی ضرورت نہیں۔ دراصل کچھ بھی نہیں چاہئے''۔

اس نے دستانے اتار لئے تھے اور اخبار کھول رہی تھی جو ابھی ڈاک خانے

سے لایا گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی صریحاً کوشش کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا:

''گزشتہ ہفتے آننا بچے کی ولادت کے وقت چل بسی، قرب و جوار میں کہیں طبی امداد کا انتظام ہوتا تو وہ آج اس دنیا میں موجود ہوتی۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مناظر فطرت کے مصوروں کو بھی اس معاملے میں کوئی نہ کوئی ٹھوس رائے رکھنی چاہیے''۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس معاملے میں میرے خیالات انتہائی واضح ہیں'' میں نے جواب دیا لیکن اس نے اپنا چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا لیا جیسے میری بات کو سننا نہ چاہتی ہو۔

''میرے خیال میں طبی امداد کے مراکز، اسکول، لائبریریاں اور ڈسپنسریاں موجودہ حالت میں صرف غلامی کی زنجیروں ہی کو کچھ اور مضبوط کر رہی ہیں۔ عوام کو جن بھاری زنجیروں نے بُری طرح جکڑ رکھا ہے انہیں توڑ ڈالنے کے لئے آپ کچھ بھی نہیں کر رہی ہیں، صرف نئی کڑیوں کا اضافہ کرتی جا رہی ہیں اور بس۔ یہ ہے ہماری ٹھوس رائے''۔

اس نے آنکھیں اٹھا کر میرے چہرے کو دیکھا اور حقارت سے مسکرائی لیکن میں نے اپنے بنیادی خیال پر زور دینے کی کوشش میں بات جاری رکھی:

''اہمیت اس کی نہیں کہ آننا بچے کو جنم دیتے وقت چل بسی، بلکہ اس کی ہے کہ ماورا، پیلا گیسیا اور دوسری اَن گنت عورتیں مجبور ہیں کہ صبح سے رات گئے تک اپنے کاموں پر جھکی رہیں، جان توڑ محنت کے نتیجے میں بیمار پڑیں، اپنی ساری زندگی بھوکے اور روگی بچوں کی فکر میں گھل گھل کر موت اور علالت کے خوف کے سائے میں گزاریں، ساری زندگی دوائیں استعمال کریں، وقت سے پہلے کملا جائیں، وقت سے پہلے بوڑھی ہو جائیں اور آخرکار گندے اور بدبودار ماحول میں مر جائیں۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو بھی وہی سب مصائب جھیلنے پڑتے ہیں جو ان کی ماؤں نے جھیلے تھے۔ اور اسی طرح سینکڑوں سال گزر جاتے ہیں، لاکھوں افراد محض روٹی کا ذرا سا ٹکڑا حاصل کرنے اور مستقل خوف میں مبتلا رہنے کے لئے ہی جانوروں سے بھی بدتر حالات میں زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ ان کے حالات کا سب سے بھیانک پہلو یہ ہے کہ انہیں کبھی بھی

اپنی روحوں کے متعلق سوچنے کا' خود کو خدا کی تخلیق اور اس کا پرتو سمجھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ بھوک' سردی' جسمانی خوف اور مسلسل محنت مشقت کی مثال برف کے تودوں جیسی ہے جو روحانی سرگرمیوں کی طرف' ہر اس شے کی طرف جانے والی تمام راہیں مسدود کر دیتے ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتی اور زندگی کو زندگی بناتی ہیں۔ آپ اسکولوں اور اسپتالوں کے ذریعے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہیں لیکن یہ مدد انہیں زنجیروں سے رہائی تھوڑی دلاتی ہے' یہ تو انہیں کچھ اور بھی زیادہ غلام بنا دیتی ہے کیونکہ آپ ان کی زندگیوں میں نئے نئے توہمات داخل کر کے ان کی ضروریات کو بڑھا دیتی ہیں۔ اور اس کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ ان لوگوں کو اپنی لیپوں اور کتابوں کے لئے زیمستوو کو کچھ دینا پڑتا ہے جسے کمانے کے لئے انہیں اور بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے"۔

"میں آپ سے بحث نہ کروں گی" لیدا نے اخبار کو نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔ "یہ ساری دلیلیں اس سے پہلے بھی سن چکی ہوں۔ صرف ایک بات عرض کرنا چاہتی ہوں: یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آدمی کچھ کرے ہی نہیں' بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ یہ تو سچ ہے کہ ہم ساری انسانیت کو نجات نہیں دلا رہے ہیں اور شاید ہم سے بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں لیکن جو ہمارے بس میں ہے' سو کر رہے ہیں اور ہمارا طرزِ عمل درست ہے۔ کسی مہذب شخص کا انتہائی اعلیٰ و ارفع اور مقدس فرض یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی مدد کرے اور ہم حتی الامکان کر بھی یہی رہے ہیں۔ آپ کو ہمارے کام پسند نہیں ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہم ہر ایک کو تو خوش نہیں رکھ سکتے"۔

"سچ کہتی ہو لیدا' بالکل سچ" یکا تیرینا پاولوونا بول پڑیں۔

دراصل لیدا کی موجودگی میں وہ بچاری ہمیشہ سے لیدا کو گھبرا گھبرا کے دیکھتی جاتی تھیں کہ ان کے منہ سے کوئی احمقانہ یا نامناسب بات نہ نکل جائے۔ وہ اپنی بڑی بیٹی کے کسی خیال کی کبھی تردید نہیں کرتی تھیں' ہمیشہ بس ہاں میں ہاں ملاتی رہتی تھیں: "سچ کہتی ہو لیدا' بالکل سچ"۔

"کسانوں کی خواندگی' واہیات پند و نصائح اور دانا اقوال سے بھری ہوئی کتابیں اور طبی امداد کے مراکز ان لوگوں کی جہالت یا ان کی شرح اموات کو بس اسی حد تک کم کر سکتے ہیں جس حد تک آپ کی کھڑکیوں کی روشنیاں اس وسیع و عریض باغ کی تاریکی

کو' میں نے کہا۔ ''آپ ان لوگوں کی زندگیوں میں صرف مداخلت کر کے' نئی ضروریات اور ان ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں کام کے نئے محرکات پیدا کر کے انہیں کچھ دے نہیں رہی ہیں''۔

''اوہ میرے خدا! لیکن کچھ نہ کچھ تو کیا ہی جانا چاہئے!''

لیدا نے جھلاہٹ کے ساتھ کچھ اس لہجے میں کہا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری دلیلوں کو حقیر اور قابل نفرت تصور کرتی ہے۔

''لوگوں کو دشوار جسمانی محنت سے نجات دلائی جانے چاہئے'' میں نے کہا۔ ''ان کا بوجھ کچھ ہلکا کیا جانا چاہیئے' انہیں ذرا دم لینے کی مہلت ملنی چاہئے تاکہ وہ اپنی ساری زندگیاں آتش دان اور کپڑے دھونے کے ٹب کے پاس یا کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ہی نہ گزار دیں بلکہ ان کے پاس اپنی روحوں کے متعلق' خدا کے متعلق سوچنے کا کچھ وقت ہو اور انہیں اپنی روحانی صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع مل سکے۔ ہر فرد کا ایک روحانی مقصد بھی ہوتا ہے اور وہ ہے سچائی اور زندگی کے معنی و مفہوم کی مسلسل تلاش۔ آپ ان کو سخت جسمانی محنت مشقت سے نجات دلا دیجئے' انہیں محسوس کرنے دیجئے کہ وہ آزاد ہیں اور تب آپ دیکھیں گی کہ یہ کتابیں اور ڈسپنسریاں واقعی کتنی قابل مضحکہ ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے حقیقی مقصد کو سمجھ جاتا ہے تو پھر اسے اس قسم کی معمولی چیزیں نہیں بلکہ صرف مذہب' سائنس اور آرٹ ہی مطمئن کر سکتے ہیں''۔

''ہونہہ' انہیں محنت مشقت سے نجات دلا دیجئے!'' لیدا نے مذاق اڑایا۔ ''جیسے کہ یہ ممکن ہی تو ہو!''

''جی ہاں! ان کا کچھ کام آپ خود سنبھال لیجئے۔ اگر ہم سب' شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے' بلا کسی استثناء کے تمام افراد اس محنت میں حصہ لینے پر تیار ہو جائیں جس پر انسانوں کی زبردست اکثریت مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنا سارا وقت صرف کرتی ہے تو شاید ہم میں سے ہر ایک کو دو تین گھنٹے یومیہ سے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ ذرا سوچئے نا! اگر ہم سب امیر اور غریب صرف تین گھنٹے یومیہ کام کریں اور باقی وقت فرصت ہی فرصت ہو تو کیسی شاندار بات ہو! اور یہ بھی سوچئے کہ اگر ہم اپنے جسموں کے اور بھی کم محتاج ہونے کے لئے' اور بھی کم کام کرنے کے لئے زیادہ محنت

طلب کام انجام دینے والی مشینیں ایجاد کرلیں اور اپنی ضروریات کی تعداد کو گھٹا کر کم سے کم کر دیں تو کیسا رہے! ہم خود کو اور اپنے بچوں کو جفاکش بنالیں گے جس کے نتیجے میں بچوں کی بھوک اور سردی سے خوف نہ محسوس ہوگا اور ہمیں ان کی صحت کی طرف سے یوں مسلسل تشویش نہ لاحق رہے گی جس طرح کہ آج آننا' پیلا گیسیا اور ان گنت ماؤں کو لاحق ہے۔ ذرا سوچئے تو! اگر ہم دوائیں نہ استعمال کریں' اگر ڈسپنسریاں' تمباکو فیکٹریاں اور شراب ساز کارخانے نہ چلائیں تو ہمارے پاس کتنا زیادہ فالتو وقت بچ رہے! ہم اس وقت کو مل جل کر سائنس اور آرٹ پر صرف کر سکتے ہیں۔ جس طرح کسان کبھی کبھی مل جل کر سڑکوں کی مرمت کر لیتے ہیں یا اسی طرح سب کی مرضی سے ہم لوگ مشترکہ طور پر سچائی اور زندگی کے معنی و مفہوم کو تلاش کر سکتے ہیں اور...... اس کا مجھے پورا یقین ہے...... سچائی جلد ہی دریافت کر لی جائے گی اور انسانیت کو موت کے دائمی' اذیت ناک اور بے رحم خوف ہی سے نہیں بلکہ خود موت سے بھی نجات مل جائے گی''۔

''لیکن آپ تو خود ہی اپنی تردید کر رہے ہیں'' لیدا نے کہا۔ ''ایک طرف تو سائنس کی وکالت کرتے ہیں اور دوسری طرف لوگوں کو خواندہ بنانے کے تصور کو ٹھکراتے ہیں''۔

''یہ خواندگی جس سے بس اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص شراب خانوں کے سائن بورڈ پڑھ لے یا کبھی کبھار کتابیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتا' ہمارے ملک میں ریوریک کے زمانے ہی سے موجود رہی ہے۔ گوگول کا پیتر دشکا' عرصے سے پڑھنا جانتا ہے پھر بھی ہمارے دیہی علاقوں کی حالت آج بھی ریوریک کے زمانے کی جیسی ہی ہے۔ ہمیں ضروریات خواندگی کی نہیں بلکہ خالی وقت کی ہے جس میں ہم اپنی روحانی اہلیتوں کا پوری طرح اظہار کر سکیں۔ ہمیں اسکول نہیں بلکہ یونیورسٹیاں چاہئیں''۔

''اور آپ طبی سائنس کے بھی منکر ہیں''۔

''ہاں! اس کی ضرورت بیماری کے صرف ایک مظہر قدرت کی حیثیت سے مطالعے کے لئے ہوگی' علاج کے لئے نہیں۔ علاج کی ضرورت ہی ہو تو بیماری کا نہیں بلکہ بیماری کے اسباب کا پتہ ہونا چاہئے۔ خاص سبب یعنی جسمانی محنت کو ختم کر دیجئے اور بیماریوں کا وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔ میں اس طبی سائنس کو تسلیم نہیں کرتا جو شفا بخشنے کی متمنی ہے''

میں نے بڑے جوش و خروش سے اپنی بات جاری رکھی۔ ''حقیقی سائنس اور آرٹ کا مقصد عارضی اور جزوی نہیں بلکہ دائمی اور ہمہ گیر اقدامات کرنا ہے۔ حقیقی سائنس اور آرٹ تو سچائی اور زندگی کے مفہوم کے' خدا اور روح کے متلاشی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں عارضی ضروریات کا' ڈسپنسریوں اور لائبریریوں کا پابند کر دیا جاتا ہے تو وہ بارِ حیات کو پیچیدہ کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹروں' دواسازوں اور قانون دانوں کی کوئی کمی نہیں اور اب تو خواندہ افراد کی بھی بھرمار ہے لیکن حیاتیات داں' ریاضی داں' فلسفی اور شاعر چراغ لے کے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ ہماری ساری ذہانت ساری روحانی توانائی عارضی اور فوری ضروریات کی تکمیل میں ضائع ہو جاتی ہے...... سائنس دانوں' ادیبوں اور مصوروں کا کام جوش و خروش سے جاری رہتا ہے' ان کی بدولت زندگی کی آسائشوں میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہماری مادی ضروریات دن دونی رات چوگنی رفتار سے بڑھتی رہتی ہیں۔ پھر بھی ہم سچائی سے اب بھی بہت دور ہیں' انسان آج بھی سفاک ترین اور گندہ ترین جاندار ہے اور ہر شے ساری انسانیت کے انحطاط اور قوتِ حیات کے ناقابل تلافی زیاں کی طرف مائل ہے۔ اس قسم کے حالات میں مصور کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہ جتنا زیادہ باصلاحیت ہوتا ہے اتنا ہی اس کا پیشہ بدتر اور زیادہ ناقابل فہم ہوتا ہے کیونکہ دیکھنے میں یہی لگتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے نظام اور حالات کی حمایت کر کے ایک سفاک اور گندے جاندار کی تفریح کے لئے کام کر رہا ہے۔ اور میں کام نہیں کرنا چاہتا' کروں گا بھی نہیں...... کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے' دنیا کو چیخ چنگھاڑ کے ساتھ پاش پاش ہو جانے دیجئے!''

''ارے میسوس! تم یہاں سے جاؤ!'' لیدا نے چھوٹی بہن سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے الفاظ کو اس لائق بھی نہیں سمجھتی کہ وہ کم سن لڑکی کے کانوں میں پڑیں۔

ژینیا نے اداس اداس نظروں سے بہن اور پھر ماں کو دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔

''لوگ ایسی ایسی اونچی باتیں عموماً تبھی کرتے ہیں جب اپنی لاپروائی کو صحیح ثابت کرنا ہوتا ہے'' لیدا نے کہا۔ ''اسپتالوں اور اسکولوں کی افادیت سے انکار کرنا ظاہر ہے کہ علاج کرنے اور پڑھانے سے ہزار درجہ آسان ہے''۔

''سچ کہتی ہو' لیدا' بالکل سچ'' یکاتیرینا پاولوونا بول پڑیں۔

"آپ کہتے ہیں کہ مصوری کو ٹھکرا دیں گے" لیدا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "صاف ظاہر ہے کہ آپ اپنے کام کو بڑے بلند پایے کا سمجھتے ہیں۔ اس بحث کو اب ختم کر دینا چاہیے' ہم لوگ کبھی بھی ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں گے کیونکہ میں ان انتہائی ناقص لائبریریوں اور ڈسپنسریوں کو جن کا تذکرہ آپ ابھی ابھی اتنی زیادہ حقارت کے ساتھ کر رہے تھے' دنیا کی مناظر فطرت کی تمام تصویروں سے کہیں زیادہ بلند و برتر تصور کرتی ہوں"۔ اچانک وہ اپنی ماں کی طرف مڑی اور بالکل مختلف لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ "کنیاز بہت دبلے ہو گئے ہیں گزشتہ بار جب یہاں آئے تھے اس کی بہ نسبت بہت بدل گئے ہیں۔ انہیں وشی بھیجا جا رہا ہے"۔

اس نے اپنی ماں سے کنیاز کا تذکرہ صرف اس لئے چھیڑا تھا کہ مجھ سے مخاطب نہ ہونا پڑے۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور وہ اپنی جھلاہٹ کو چھپانے کے لئے اخبار پڑھنے کے بہانے میز پر یوں جھک گئی جیسے کوتاہ بیں ہو۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میری موجودگی ناگوار ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں رخصت ہو کے چلا آیا۔

احاطے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تالاب کے دوسرے کنارے پر واقع گاؤں میں سوتا پڑ چکا تھا اور سطح آب پر ستاروں کی زرد' تقریباً غیر مرئی طور پر ٹمٹماتی ہوئی پرچھائیوں کے سوا کہیں کسی روشنی کا وجود نہ تھا۔ شیروں والے پھاٹک پر ژینیا مجھے رخصت کرنے کے لئے بے حس و حرکت کھڑی ہوئی تھی۔

"گاؤں میں سب لوگ سو چکے ہیں" میں نے تاریکی میں اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا' لیکن مجھے بس دو کالی کالی مغموم آنکھیں ہی نظر آ سکیں جو مجھے تکے جا رہی تھیں۔ "سرائے کا مالک اور گھوڑے چور تو گہری نیند سوتے ہیں اور ہم شائستہ افراد ایک دوسرے کو غصہ دلاتے اور بحث کرتے ہیں"۔

یہ اگست کی ایک اداس رات تھی' اداس اس لئے کہ فضائیں آمد خزاں کی آئینہ دار تھیں۔ چاند دھیرے دھیرے قرمزی بادلوں کے عقب سے ابھر رہا تھا لیکن اس کی ہلکی چاندنی سڑک کو جس کے دونوں پہلوؤں پر خزاں کے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے' بمشکل ہی منور کر پا رہی تھی۔ آسمانوں پر ٹوٹتے ہوئے ستارے تیزی سے اِدھر اُدھر

جھپٹ رہے تھے۔ ژینیا جو سڑک پر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی' کوشاں تھی کہ آسمان کی طرف نظریں نہ اٹھائے کیونکہ ٹوٹے ہوئے تاروں کا نظارہ اسے جانے کیوں خوف زدہ کر دیتا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ آپ کا خیال درست ہے'' اس نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم سب مشترکہ طور پر روحانی سرگرمیوں میں مصروف ہو جائیں تو جلد ہی سب کچھ دریافت کر لیں''۔

''بے شک ہم اشرف المخلوقات ہیں اور اگر ہم غیر معمولی انسانی ذہانت کی قوتوں کی صحیح معنوں میں قدر کریں اور صرف اعلیٰ تر مقاصد کے لئے زندہ رہیں تو ایک نہ ایک دن دیوتاؤں جیسے تو بن ہی جائیں۔ لیکن وہ دن کبھی بھی نہ آئے گا۔ انسانیت مائل بہ زوال ہے اور جلد ہی غیر معمولی ذہانت کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا''۔

ہم دونوں جب اتنی دور نکل آئے جہاں سے پھاٹک دکھائی نہیں دے رہا تھا تو ژینیا نے اچانک ٹھہر کے جلدی سے میرا ہاتھ دبا دیا۔

''شب بخیر!'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ اس کے شانوں پر ہلکے بلاوز کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا اور وہ سردی کے مارے سمٹی جا رہی تھی۔ ''کل آیئے گا''۔

اپنے آپ اور دوسروں سے بے اطمینانی کی اس جھنجھلائی ہوئی حالت میں تنہا ہو جانے کا تصور کر کے میں بری طرح سہم گیا اور میں بھی کوشش کرنے لگا کہ ٹوٹتے ہوئے ستاروں پر نظریں نہ پڑیں۔

''کچھ دیر اور میرے ساتھ رہیے نا'' میں نے کہا۔ ''بڑی عنایت ہوگی''۔

مجھے ژینیا سے محبت ہو گئی تھی۔ میں اس کی محبت میں شاید اس لئے مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے اور مجھے رخصت کرنے کے لئے پھاٹک پر میری منتظر رہتی تھی اور مجھے بڑی پیار بھری' بڑی پرستائش نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کا زرد چہرہ' دبلی پتلی گردن اور بانہیں' اس کی نزاکت' کاموں کی طرف سے اس کی لاپروائی' اس کی کتابیں سب کچھ میرے لئے باعث کشش تھا۔ اور اس کا ذہن؟ میں سوچتا تھا کہ شاید وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے' میں اس کی وسیع الخیالی کا بھی مداح تھا۔ جس کا سبب شاید یہ تھا کہ اس کے سوچنے کا انداز حسین وجمیل لیکن سخت مزاج لیدا سے جو مجھے پسند کرتی تھی' مختلف تھا۔

ژینیا مجھے مصور کی حیثیت سے پسند کرتی تھی' میں نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے اس کا دل جیت لیا تھا اور میری شدید خواہش تھی کہ صرف اسی کے لئے مصوری کروں' صرف اپنی اسی کم سن ملکہ کے خواب دیکھوں جو میرے ساتھ مل کر ان گاؤں اور کھیتوں پر' اس کہرے اور شام کی تابانی پر اور اس سارے خوبصورت اور دلکش دیہی علاقے پر حکمرانی کرے' جہاں میں اس وقت تک خود کو بُری طرح اداس' تنہا اور غیر ضروری محسوس کرتا رہا تھا۔

''کچھ دیر اور ٹھہر جایئے نا!'' میں نے منت کی۔ ''صرف چند لمحے اور''۔

میں نے اپنا کوٹ اتار کے اس کے برف جیسے سرد شانوں کو ڈھک دیا۔ وہ اس خیال سے کہ مرد کے کوٹ میں عجب بدصورت سی لگ رہی ہو گی' ہنس پڑی اور میرے کوٹ کر نیچے گرا دیا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے چہرے' شانوں اور ہاتھوں کو بے تابی سے پیار کرنے لگا۔

''اچھا تو کل تک کے لئے رخصت!'' اس نے مجھے کچھ اس احتیاط سے لپٹاتے ہوئے کہا جیسے ڈر رہی ہو کہ شب کے سناٹے کو کہیں توڑ نہ دے۔ ''ہمارے ہاں ایک دوسرے سے کوئی بات راز نہیں رکھی جاتی' مجھے اپنی والدہ اور بہن کو فوراً ہی سب کچھ بتا دینا ہو گا......اوہ! کتنی دہشت طاری ہے مجھ پر! امی تو خیر ٹھیک ہیں' وہ آپ کو پسند بھی کرتی ہیں لیکن لیدا بہن!''

اور وہ پھاٹک کی طرف مڑ کے دوڑنے لگی۔

''خدا حافظ!'' اس نے پکار کے کہا۔

میں چند لمحوں تک اس کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آہٹوں کو سنتا رہا۔ حویلی کو لوٹ جانے کو نہ جی چاہ رہا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ تھی۔ کچھ دیر وہیں خیالوں میں غرق کھڑے رہنے کے بعد اس گھر کو ایک بار پھر دیکھنے کے لئے دھیرے دھیرے واپس لوٹا جہاں ژینیا رہتی تھی' پیارا' بے تصنع' قدیم گھر جس کی نیچی چھت والی درمیانی منزل کی کھڑکیاں مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کہ وہ آنکھیں ہوں' جیسے کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہوں' برآمدے سے گزر کے میں ٹینس کورٹ کے قریب بید کے ایک پرانے درخت کے نیچے

تاریکی میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور وہاں سے گھر کو تکنے لگا۔ درمیانی منزل پر جہاں ژینیا رہتی تھی، کھڑکیوں میں چمکتی ہوئی تیز روشنی ہلکی سبز رنگ اختیار کر گئی۔ لیمپ پر کسی نے شیڈ رکھ دیا تھا۔ سائے متحرک تھے...... میرا پرسکون اور مطمئن دل لطیف جذبات سے معمور تھا، یہ دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کہ میں محبت میں مبتلا ہونے کی بھی اہلیت رکھتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس خیال سے پریشان بھی تھا کہ اس وقت چند ہی قدموں کے فاصلے پر اسی گھر کے ایک کمرے میں لیدا بھی موجود ہے جو مجھے پسند نہیں کرتی، جو شاید مجھ سے نفرت بھی کرتی ہے۔ میں آنکھوں پر زور دے کر تکے جا رہا تھا، انتظار کر رہا تھا کہ شاید ژینیا نمودار ہو جائے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ درمیانی منزل پر ہونے والی باتوں کی آوازیں سن رہا ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹہ یوں ہی گزر گیا۔ سبز روشنی بھی گل ہو گئی اور اب سائے نظر نہیں آ رہے تھے۔ چاند ابھر کر گھر کے اوپر پہنچ چکا تھا اور خوابیدہ باغ اور سنسان روشوں پر چاندی بکھری ہوئی تھی۔ عمارت کے سامنے کیاری میں ڈیلیا اور گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے، لیکن سب کے سب ایک ہی رنگ کے معلوم ہو رہے تھے۔ سردی اب واقعی چمک اٹھی تھی۔ میں باغ سے باہر نکلا، سڑک پر جا کے اپنا کوٹ اٹھایا اور دھیرے دھیرے حویلی کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اگلی سہ پہر کو میں وولچا نینوف خاندان کے ہاں پہنچا تو باغ کی طرف والا شیشے کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ میں اس امید میں برآمدے میں بیٹھ گیا کہ ژینیا اچانک ٹینس کورٹ یا کسی روش پر نمودار ہو گی یا اس کی آواز گھر کے اندر سے سنائی دے گی۔ پھر کچھ دیر بعد میں ڈرائنگ روم میں گیا اور وہاں سے کھانے کے کمرے میں، کہیں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ کھانے کے کمرے سے میں ایک طویل گزرگاہ سے ہوتا ہوا مکان کے اگلے حصے تک آیا اور دوبارہ واپس لوٹا۔ گزرگاہ میں کئی دروازے کھلے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک سے لیدا کی آواز سنائی دی:

''کوے کو کہیں...... خدا کی عنایت سے......'' وہ زور زور سے الفاظ کو کھینچ کھینچ کر ادا کرتے ہوئے غالباً املا بول رہی تھی۔ ''خدا کی عنایت سے پنیر کا ایک ٹکڑا...... مل گیا

تھا۔ کوے کو...... کہیں پر...... کون ہے؟'' میری آہٹ سنتے ہی اس نے پکار کر پوچھا۔

''یہ میں ہوں''

''اوہ...... معاف کیجئے گا' میں اس وقت آپ کے پاس نہیں آ سکتی داشا کو پڑھا رہی ہوں''۔

''یکا تیرینا پاولوونا باغ میں ہیں کیا؟''

''جی نہیں! وہ اور میری بہن آج صبح پیزا صوبے کے لئے روانہ ہو گئیں' میری خالہ کے ہاں گئی ہیں' اور سردیوں میں وہ دونوں شاید ملک سے باہر جائیں گی......'' اس نے کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''کوے کو...... کہیں پر...... خدا کی عنایت سے پنیر کا ایک ٹکڑا...... مل گیا تھا...... لکھ لیا نا؟''

میں مکان کے باہر آ گیا اور کھڑے کھڑے خالی خالی نظروں سے تالاب اور دوری پر واقع گاؤں کو تکنے لگا۔ لیدا کے الفاظ اب بھی میرے کانوں پر ضرب لگائے جا رہے تھے:

''پنیر کا ایک ٹکڑا...... کوے کو کہیں پر خدا کی عنایت سے پنیر کا ایک ٹکڑا مل گیا تھا......''

میں نے جاگیر سے نکلنے کے لئے وہی راستہ اپنایا جس سے پہلی بار آیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ الٹی سمت سے احاطے سے باغ میں گیا' پھر مکان کے قریب سے گزرا اور لنڈن کے درختوں والی روش پر پہنچ گیا...... یہاں ایک چھوٹا لڑکا دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے مجھے ایک پرچہ دیا۔ ''میں نے اپنی بہن کو سب کچھ بتا دیا اور ان کا اصرار ہے کہ ہمیں جدا ہو جانا چاہئے'' میں نے پڑھا۔ ''میں اتنی سنگدل نہ ہو سکی کہ انہیں اپنی حکم عدولی سے دکھ پہنچاتی۔ خدا آپ کو مسرتیں عطا فرمائے۔ مجھے معاف کر دیجئے! کاش آپ کو معلوم ہو سکتا کہ میں اور ممی کیسے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی ہیں!''

پھر صنوبر کے درختوں والی روش ملی اور شکستہ ریلنگیں...... کھیت میں جہاں کبھی رائی پھولی ہوئی تھی اور بٹیریں چہچہا رہی تھیں' اب گائیں اور چھندے ہوئے گھوڑے منڈلا رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹیلوں پر سرمئی رنگ کی فصلیں ہری بھری نظر آ رہی تھیں۔ میرے

ذہن پر روزمرہ کی غیر شاعرانہ کیفیت طاری ہوگئی، مجھے ان ساری باتوں کے تصور سے جو میں نے وولچانینوف خاندان کے ہاں کہی تھیں، شرم محسوس ہونے لگی اور زندگی ایک بار پھر وبال جان معلوم ہونے لگی۔ حویلی میں واپس لوٹ کے میں نے سامان باندھا اور اسی شام کو پیٹرس برگ کے لئے روانہ ہوگیا۔

وولچانینوف خاندان کے کسی رکن سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوسکی۔ کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ میں کریمیا جا رہا تھا تو ٹرین پر بیلوکوروف مل گئے۔ وہ اب بھی کسانوں کے جیسے کوٹ اور کڑھی ہوئی قمیض میں ملبوس تھے اور میں نے ان کا مزاج پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ''آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں'' پھر باتیں چل نکلیں، پتا چلا کہ انہوں نے اپنی جاگیر فروخت کر کے نسبتاً چھوٹی جاگیر لیوبوف ایوانوونا کے نام سے خرید لی تھی۔ وولچانینوف خاندان کے متعلق وہ کچھ زیادہ نہ بتا سکے۔ لیدا اب بھی شیلکووفکا ہی میں رہتی اور گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اسے اپنے اردگرد اپنے ہم خیالوں کا ایک حلقہ قائم کرنے میں کامیابی ہوگئی تھی۔ خاصا طاقتور گروپ تھا اور اس نے زیمستوو کے گزشتہ جلسے میں بالاگین کے خلاف جو اس وقت تک سارے ضلعے کو مٹھی میں کئے ہوئے تھے، ووٹ دے کر اسے عہدے سے ہٹا دیا تھا۔ ژینیا کے متعلق بیلوکوروف بس اتنا ہی بتا سکے کہ وہ شیلکووفکا میں نہیں رہتی، کہاں رہتی ہے اس کی ان کو خبر نہ تھی۔

نیچی چھت کی درمیانی منزل والے اس مکان کو میں اب بھول سا چلا ہوں، لیکن کبھی کبھار تصویر بناتے یا مطالعہ کرتے وقت جانے کیوں کھڑکی کی وہ سبز روشنی، شب کے سناٹے میں کھیتوں میں گونجتی ہوئی اپنے قدموں کی وہ آہٹیں اور وہ رات یاد آجاتی ہے جب میں محبت میں مبتلا ہو کے اپنے سرد ہاتھوں کو گرمی پہنچانے کے لئے ایک دوسرے سے رگڑتا ہوا حویلی کو واپس لوٹا تھا۔ اس سے بھی کم مواقع ایسے آتے ہیں جب میں کھو جاتا ہوں اور دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کوئی مجھے بھی یاد کر رہا ہے، کوئی میری بھی راہ دیکھ رہا ہے اور یہ کہ ہماری ملاقات ہوگی......

''میسوس! کہاں ہو تم اب؟''

چیخوف

اپنے خول کے اندر کا آدمی

شکاری میرونوسیسکوے گاؤں کے قریب پہنچے تو تاریکی چھا گئی اور انہوں نے گاؤں کے مکھیا پروکوفی کے شیڈ میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دو تھے' مویشی ڈاکٹر ایوان ایوانچ اور ہائی اسکول ٹیچر بورکین۔ ایوان ایوانچ کے نام کا آخری حصہ اپنے نشان الحاق سمیت عجیب وغریب سا تھا۔ چیمشا۔ ہمالائیسکی جو اس کے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتا تھا اور سارے علاقے کے لوگ اسے بس اس کے نام اور باپ کے نام سے ہی مخاطب کیا کرتے تھے یعنی ایوان ایوانچ۔ وہ شہر سے کچھ فاصلے پر گھوڑوں کے ایک فارم پر رہتا تھا اور محض کھلی ہوا میں گھومنے پھرنے کے خیال سے ہی شکار پر نکلا تھا۔ جہاں تک ہائی اسکول ٹیچر بورکین کا تعلق تھا تو وہ گرمیاں ہر سال کاؤنٹ پی۔ کی جاگیر پر گزارتا تھا اور ان علاقوں کے لوگ اس کا اپنوں ہی میں شمار کیا کرتے تھے۔

دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ طویل قامت' دبلے پتلے جسم اور لمبی لمبی مونچھوں والا بوڑھا ایوان ایوانچ دروازے کے باہر چاندنی میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا اور بورکین اندر تاریکی میں سوکھی گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔

وقت گزارنے کے لئے وہ ایک دوسرے کو قصے سنانے لگے۔ مکھیا کی بیوی ماؤک کا ذکر چھڑ گیا جس کی صحت بہت عمدہ تھی' کسی بھی لحاظ سے کوڑھ مغز نہیں کہی جا سکتی تھی' پر زندگی میں کبھی بھی اپنے آبائی گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی۔ اس نے نہ کبھی کوئی شہر دیکھا تھا' نہ ریلوے لائن اور گزشتہ دس برس اپنے آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے کاٹ دیئے تھے' باہر نکلنے کی جرأت صرف رات ہی کو کر پاتی تھی۔

''بھلا یہ کون سی عجیب وغریب بات ہے!'' بورکین نے کہا۔ ''اس دنیا میں جانے

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو مزاجاً گوشہ نشین ہوتے ہیں اور گھونگے یا کیکڑے کی طرح اپنے خولوں کے اندر ہی سمانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ شاید یہ محض پرکھوں سے مشابہت کا اظہار اور ان زمانوں کی طرف واپسی ہے جب ہمارے آباؤ اجداد ساتھ ساتھ رہنے والے جاندار نہیں بن سکے تھے اور اکیلے اکیلے غاروں میں رہا کرتے تھے یا پھر شاید اس طرح کے افراد انسانوں کی مختلف اقسام میں سے ایک ہوں' کون جانے؟ میں حیوانات اور نباتات کا ماہر تو ہوں نہیں جو اس قسم کے مسائل کو حل کرنے میں سر کھپاؤں' ہاں یہ البتہ کہہ سکتا ہوں کہ ماوک جیسے افراد ایسے انوکھے نہیں کہ بس خال خال ہی پائے جاتے ہوں۔ ابھی مہینے دو مہینے پہلے ہمارے شہر ہی میں ایسے ہی ایک آدمی کا انتقال ہو گیا۔ میرے ساتھ کام کرتا اور یونانی زبان پڑھتا تھا' نام تھا بیلیکوف''۔ آپ نے اس کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ اس سے اس کی عادت کی بناء پر سبھی واقف تھے کہ اپنے گھر سے کبھی بھی حتیٰ کہ بہترین موسم میں روئی دار کوٹ اور جوتوں کے اوپر ربر کے جوتے پہنے اور چھتری لئے بغیر قدم نہیں نکالتا تھا۔ چھتری خول کے اندر رہتی تھی' گھڑی بھورے چرمی خول کے اندر رہتی تھی اور جب وہ پنسل کی نوک تیز کرنا چاہتا تھا تو جیبی چاقو کو بھی اسے خول کے اندر ہی سے نکالنا پڑتا تھا۔ چہرے پر بھی لگتا تھا کہ ایک طرح کا خول ہی چڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ کوٹ کے کھڑے ہوئے کالروں میں ہمیشہ چھپا رہتا تھا۔ دو سیاہ شیشوں کی عینک اور روئی دار کوٹ استعمال کرتا تھا' کانوں میں روئی ٹھونسے رہتا تھا اور کبھی بگھی پر بیٹھتا تو ہڈ ضرور اٹھوا دیا کرتا تھا۔ دراصل اس کا سارا طرزِ عمل اس کی مستقل اور دبائی نہ جا سکنے والی اس خواہش کا آئینہ دار معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے لئے کسی ایسے غلاف کو وجود میں لاتا رہے جو اسے خارجی اثرات سے الگ تھلگ اور محفوظ رکھ سکے۔ حقیقت اسے جھنجلاہٹ' تشویش اور مسلسل خوف میں مبتلا رکھتی تھی اور شاید وہ اپنے بودے پن اور حال سے اپنی بیزاری پر پردہ ڈالنے کے لئے ہی ہمیشہ ماضی اور ان چیزوں کے گن گاتا رہتا تھا جن کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ جن قدیم زبانوں کو وہ پڑھاتا تھا وہ بھی اس کے اور حقیقی زندگی کے درمیان بس ربڑ کے جوتوں اور چھتری ہی کی حیثیت رکھتی تھیں۔

''یونانی زبان کی خوبصورتی اور بلند آہنگی کا کہنا ہی کیا!'' وہ پر مسرت لہجے میں کہتا اور ثبوت کے طور پر آنکھیں آدھی بند کر کے ایک انگلی اوپر اٹھاتے ہوئے بدبداتا:

''اینتھروپوس!''

بیلیکوف اپنے خیالات تک کو خول کے اندر ہی رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ صرف وہی سرکاری گشتیاں اور اخباری مضامین اس کی سمجھ میں آتے تھے جن کے ذریعے کوئی چیز ممنوع قرار دی جاتی تھی۔ اسکولی لڑکوں کے نو بجے رات کے بعد سڑکوں پر گھومنے پھرنے پر پابندی لگانے سے متعلق ہدایات جاری ہوتیں یا کوئی ایسا مضمون شائع ہوتا تھا جس میں جنسی محبت کی مذمت کی جاتی تھی تو اس پر سب کچھ قطعی شکل میں واضح ہو جاتا تھا' وہ نتیجہ اخذ کر لیتا تھا کہ ان چیزوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پابندی لگ گئی۔ اجازت اور مخصوص رعایت میں اسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی شک کا عنصر' کوئی نہ کوئی اَن کہی' مبہم بات نظر آتی تھی۔ کسی ڈرامہ سوسائٹی' ریڈنگ روم یا کیفے کے کھلنے کی اجازت ملتی تو وہ سر ہلا کے نرم لہجے میں کہا کرتا تھا:

''(بات تو یقیناً بہت اچھی ہے لیکن......توبہ' کہیں کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔)''

ضوابط کی ہلکی سی بھی خلاف ورزی یا ان سے انحراف اسے اس صورت میں بھی بُری طرح مغموم کر دیتا تھا جب معاملے کا خود اس سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ اس کے کسی ساتھی کو عبادت کے لئے پہنچنے میں کبھی تاخیر ہو جاتی' اسکولی لڑکوں کی کسی شرارت کی افواہیں اس کے کانوں تک پہنچتیں یا اونچے طبقے کی کوئی عورت رات گئے کسی افسر کے ساتھ دیکھی جاتی تو وہ بے حد پریشان ہو اٹھتا اور بار بار کہتا رہتا تھا کہ اسے ڈر ہے کہ انجام اچھا نہ ہوگا۔ اساتذہ کی کونسل کے جلسوں میں وہ اپنی چوکسی اور شکوک سے' اپنے اندیشوں اور تجاویز سے ہم سب کے لئے عذابِ جان بن جاتا تھا۔ اس کی یہ باتیں جو کسی خول میں بند ذہن ہی کو سوجھ سکتی تھیں' کچھ اس نوعیت کی ہوتی تھیں: لڑکیوں کا اسکول ہو یا لڑکوں کا دونوں میں نوجوان افراد کا طرزِ عمل انتہائی شرمناک ہے' کلاسوں کا شور کان کے پردے پھاڑتا رہتا ہے۔ توبہ' ذمے داروں کو کہیں اس کی بھنک

لگ گئی تو؟ توبہ کہیں کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔

اور اگر ہم پیتروف کو دوسرے اور ایگوروف کو چوتھے درجے سے خارج کر دیں تب تو بہت ہی اچھا ہو۔ اور ایوان ایوانچ' آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟ یہ شخص اپنی ٹھنڈی سانسوں اور آہوں سے' اپنے چھوٹے سے سفید چہرے...... یوں سمجھئے کہ بالکل سفید نیولے جیسے چہرے پر لگی ہوئی سیاہ شیشوں کی عینک سے ہمیں اس حد تک تنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ہم نے ہار مان لی' پیتروف اور ایگوروف کو طرزِ عمل میں بہت کم نمبر دیئے' انہیں کمرے میں بند کرایا اور آخر کار اسکول سے خارج کر دیا۔ ہم لوگوں کے ہاں ملنے آنا اس کی پرانی عادت تھی۔ کسی ٹیچر ساتھی کے ہاں جا کر وہ چوکسی کے ساتھ بیٹھ جاتا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا تھا۔ کوئی گھنٹے بھر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد اٹھتا اور چل دیتا۔ اس کو وہ ''ساتھیوں سے دوستانہ مراسم برقرار رکھنا'' کہا کرتا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یہ کام خاصا ناخوشگوار معلوم ہوتا ہے اور محض ساتھی کی حیثیت سے اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے ہی ہمارے ہاں آتا ہے۔ ہم سب یہاں تک کہ ہیڈ ماسٹر بھی اس سے خائف رہتے تھے۔ ذرا سوچئے تو! ہمارے اساتذہ بحیثیت مجموعی شائستہ اور ذہین افراد ہیں' جن کی ذہنی نشوونما فیسیف اور شیدرین کی تخلیقات کے سائے میں ہوئی ہے پھر بھی ہمیشہ جوتوں کے اوپر ربڑ کے جوتے پہننے اور چھتری ساتھ رکھنے والا یہ بالشتیا سارے اسکول کو پندرہ برسوں تک اپنی انگلیوں پر نچاتا رہا! اور اسکول ہی کو نہیں سارے شہر کو! ہماری خواتین نے سنیچر کو نجی محفلوں میں ڈرامے پیش کرنے کا سلسلہ اس ڈر کے مارے بند کر دیا کہ کہیں بیلیکوف کو پتا نہ چل جائے اور پادریوں کو اس کی موجودگی میں گوشت کھانے یا تاش کھیلنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بیلیکوف جیسے افراد ہی کے زیر اثر ہمارے شہر کے لوگ ہر چیز سے خوف کھانے لگے۔ لوگوں کو تو بلند آواز سے باتیں کرنے' خطوط لکھنے' کسی سے دوستی کرنے' کتابیں پڑھنے' غریبوں کے کام آنے اور ناخواندہ افراد کو پڑھانے تک سے ڈر لگتا ہے......''

ایوان ایوانچ نے کچھ یوں حلق صاف کیا جیسے کوئی وزنی تبصرہ مقصود ہو لیکن پہلے اس نے اپنا پائپ دوبارہ سلگایا' چاند پر ایک نظر ڈالی اور تب بڑے اطمینان کے ساتھ کہا:

"بالکل ٹھیک۔ تورگیسیف، شچدرین اور بکل وغیرہ کو پڑھنے والے مہذب اور ذہین لوگوں نے بھی اس شخص کے آگے سر جھکا دیا، اس کو جھیلتے رہے...... یہی تو بات ہے"۔

"بیلیکوف اور میں ایک ہی عمارت میں رہتے تھے" بورکین نے مزید کہا۔ "ایک ہی منزل پر، دونوں کے دروازے آمنے سامنے ہی تھے، کافی ملنا جلنا بھی رہتا تھا اس لئے میں اس کی گھریلو زندگی سے بخوبی واقف تھا۔ گھر پر بھی وہی حالت تھی: ڈریسنگ گون، سوتے وقت پہننے کی ٹوپی، بند دروازہ، بیلن اور چٹخنیاں، بندشوں اور پابندیوں کی ایک طویل فہرست اور وہی تکیہ کلام...... توبہ، کہیں کوئی آفت نہ نازل ہو جائے! روزے کے زمانے کے کھانے اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ گوشت اس ڈر سے نہیں استعمال کر سکتا تھا کہ لوگ کہیں نہ کہ بیلیکوف مذہبی رسوم کی پابندی نہیں کرتا، اس لئے وہ مکھن میں تلی ہوئی پائیک مچھلی کھاتا تھا۔ یہ روزہ تو نہیں تھا لیکن اسے گوشت خوری بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نوکرانی تو اس اندیشے سے کبھی نہیں رکھی تھی کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں نہ شروع ہو جائیں لیکن ایک باورچی ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ آفاناسی نام کا، یہ ساٹھ سالہ شرابی اور خبطی بوڑھا اپنی زندگی میں کبھی افسروں کا اردلی رہ چکا تھا اس لئے کھانا بہرحال پکا لیتا تھا۔ یہ آفاناسی عموماً دروازے کے باہر بازوؤں کو موڑے کھڑے کھڑے ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے برابر بس یہی بڑبڑاتا رہتا تھا:

"ان دنوں وہ بہت نظر آتے ہیں!"

بیلیکوف کی تنگ خوابگاہ صندوق سے مشابہ تھی اور پلنگ کے اوپر ایک طرح کا نم گیرہ تنا ہوا تھا۔ سونے سے قبل وہ اپنا سر پوری طرح ڈھک لیا کرتا تھا، گرم کمرے میں گھٹن محسوس ہوتی تھی...... ہوائیں دروازے کو کھڑکھڑاتی اور چمنی میں کراہتی رہتی تھیں۔ باورچی خانے میں آہیں گونجتی رہتی تھیں، منحوس آہیں......

اور وہ کمبل کے نیچے دبکا ہوا کانپتا رہتا تھا۔ اسے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔ آفاناسی اسے قتل نہ کر دے، گھر میں چور نہ گھس آئیں اور سوتے میں وہ خواب بھی ڈراؤنے ہی دیکھتا تھا۔ صبح کو ہم دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے

اسکول جا رہے ہوتے تھے تو وہ نڈھال نڈھال سا نظر آتا تھا' چہرے پر ہوائیاں اُڑتی رہتی تھیں اور صاف پتا چلتا تھا کہ بھیڑ بھاڑ والا اسکول جہاں وہ جا رہا ہے' اس کے نزدیک ڈراؤنی اور گھناؤنی جگہ ہے اور یہ کہ مزاجاً گوشہ نشیں ہونے کی بناء پر اسے میرے ساتھ چلنا گراں گزر رہا ہے۔

''کلاسوں میں کس قیامت کا شور مچتا رہتا ہے'' وہ یوں کہا کرتا تھا جیسے اپنے دل کے بوجھ کے سلسلے میں صفائی پیش کر رہا ہو۔ ''بڑی شرمناک بات ہے''۔

اور آپ کو معلوم بھی ہے؟ یونانی زبان پڑھانے والے اس کیکڑے کی ایک بار شادی ہوتے ہوتے رہ گئی''۔

ایوان ایوانچ نے تیزی سے شیڈ کی طرف سر موڑا اور کہا:

''مذاق کر رہے ہیں کیا؟''

''نہیں! بات چاہے جتنی عجیب وغریب معلوم ہو پر حقیقت یہی ہے کہ شادی میں بس ذرا ہی سی کسر رہ گئی تھی۔ ہمارے ہاں تاریخ اور جغرافیہ کا ایک نیا ٹیچر بھیجا گیا تھا' کووالینکو میخائیل ساووچ جو یوکرینی تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بہن وارینکا کو بھی لایا۔ یہ لمبا تڑنگا سانولا نوجوان تھا' ہاتھ بہت بڑے بڑے تھے اور چہرہ ایسا جیسا کہ گہری آواز والوں کا ہوتا ہے۔ اس کی آواز واقعی بڑی گہری اور گرجدار تھی' لگتا تھا کہ پیپے سے نکل رہی ہے...... بہن اس کی جیسی نوجوان نہ تھی' تیس یا اسی کے لگ بھگ کی رہی ہوگی لیکن قد اس کا بھی طویل ہی تھا۔ دبلا پتلا' نرم ونازک جسم' سیاہ بھویں' سرخ رخسار' دلکشی میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی تھی اور اوپر سے یہ کہ اس میں زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی' جب دیکھئے تب کوئی یوکرینی گیت گا رہی ہے' ہنس رہی ہے۔ بات بات پر قہقہے لگانا تو جیسے اسی کو آتا تھا۔ بھائی بہن سے ہم لوگوں کی قریبی واقفیت ہیڈ ماسٹر کے ہاں اس سینٹ کا دن منائے جانے کی تقریب میں ہوئی جس کے نام پر ان کا نام رکھا گیا تھا۔ اچانک سخت مزاج' ضابطہ پرست اور روکھے پھیکے اساتذہ کے درمیان جو پارٹیوں تک میں اپنی شرکت کو فرض کی ادائیگی ہی تصور کرتے ہیں' محبت کی ایک نئی دیوی نمودار ہوئی جو دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر چلتی تھی' ہنستی' گاتی اور ناچتی تھی...... اس نے بڑے جذباتی

انداز میں ''ہوائیں چل رہی ہیں'' گایا پھر دوسرا گیت اور پھر تیسرا اور ہم سب پر' بیلیکوف تک پر جادو سا کر دیا۔ وہ اس حسینہ کے پاس بیٹھ گیا اور بڑی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

''یوکرینی زبان اپنی مٹھاس اور مسرت بخش بلند آہنگی کی بنا پر قدیم یونانی زبان کی یاد دلاتی ہے''۔

یہ سن کے وہ بہت خوش ہوئی اور سچے جذبات کے ساتھ گدیاچی علاقے میں کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے اپنے گھر کے متعلق بتانے لگی جہاں اس کی ماں رہتی تھی اور جہاں نہایت ہی شاندار ناشپاتیاں' سردے اور کدو پیدا ہوتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے نا' کدو کو یوکرین میں ''لوکی'' کہتے ہیں اور اسے نیلے نیلے بینگوں اور سرخ مرچوں سے ملا کر سوپ پکاتے ہیں جو ''اتنا ذائقے دار ہوتا ہے' اتنا ذائقے دار ہوتا ہے کہ نہ پوچھیے!''

ہم سب اس کے اردگرد بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے اور اچانک سب کے دلوں میں ایک ہی خیال جاگ اٹھا۔

''ارے ان دنوں کی شادی کیوں نہ ہو جائے؟'' ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

جانے کیوں یکبارگی سب کو احساس ہوا کہ یہ بیلیکوف تو کنوارا ہے اور ہمیں حیرت ہوئی کہ آخر ہم نے اس بارے میں کبھی بات کیوں نہیں کی تھی' اس کی زندگی کے اس ایسے اہم پہلو کو یکسر نظر انداز کیسے کر دیا تھا۔ آخر عورتوں کے متعلق اس کا رویہ کیا تھا' وہ ایسے ضروری مسئلے کو کس طرح حل کر رہا تھا؟ ہمیں کبھی اس معاملے کا خیال ہی نہیں آیا تھا' ہم میں سے شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سال کے ہر موسم میں جوتوں پر ربڑ کے جوتے پہننے اور نم گیرے کے نیچے سونے والا یہ آدمی کسی سے محبت کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

''بیلیکوف کی عمر چالیس سے کافی تجاوز کر چکی ہے اور یہ کوئی تیس کی ہو گی......'' ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ ''میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ بیلیکوف کو گرویدہ بنا لے

گی"۔

راجدھانی سے دور دراز علاقوں میں رہنے والے ہم لوگ جی اوبنے کی بناء پر کیسی کیسی احمقانہ اور فضول سرگرمیوں میں پڑتے رہتے ہیں! وجہ صرف اتنی سی ہے کہ جو کچھ کیا جانا چاہئے کبھی بھی نہیں کیا جاتا۔ آخر ہمیں بیلیکوف کی شادی کا خیال ہی کیوں آیا جبکہ اسے شادی شدہ شخص کے کردار میں دیکھنے کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا؟ ہیڈ ماسٹر کی بیوی' انسپکٹر کی بیوی اور دوسری خواتین جن کا اسکول سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا' کھل سی گئیں' کچھ زیادہ خوبصورت نظر آنے لگیں جیسے کہ انہیں آخر کار کوئی مقصد زندگی مل گیا ہو۔

ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے تھیٹر میں ایک علیحدہ نشست گاہ محفوظ کرائی اور وہاں ہم نے اور کسی کو نہیں' وارینکا کو بیٹھے دیکھا' چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی' ہاتھوں میں بڑا سا پنکھا تھا جسے جھلتی جاتی تھی اور بغل میں بیٹھا ہوا پستہ قد بیلیکوف' یوں سمٹا سمٹایا جیسے زنبور سے پکڑ کر اپنے کمرے سے کھینچ کے نکالا گیا ہو۔ خود میں نے بھی ایک پارٹی دی جس میں خواتین کے اصرار پر بیلیکوف اور وارینکا کو بھی مدعو کیا۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ہم لوگوں نے یہ چکر چلا ہی دیا۔ لگتا تھا کہ شادی کا خیال وارینکا کے لئے کسی بھی لحاظ سے نامرغوب نہیں ہے۔ بھائی کے ساتھ اس کی زندگی قطعاً خوشگوار نہ تھی' دونوں ہر وقت لڑتے جھگڑتے ہی رہتے۔ میں آپ کی نظروں کے سامنے ان دونوں کی زندگی کا ایک عام سماں پیش کر رہا ہوں: لمبا تڑنگا' موٹا تگڑا کووالینکو کڑھی ہوئی قمیض پہنے سڑک پر اکڑتا ہوا چلا جا رہا ہے' ٹوپی کے نیچے سے نکلے ہوئے بال پیشانی پر بکھرے ہیں' ایک ہاتھ میں کتابوں کا بنڈل ہے اور دوسرے میں گانٹھوں دار چھتری۔ بہن بھی کتابیں لئے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔

"لیکن میخائیلیک' تم نے اسے نہیں پڑھا!" وہ زور سے کہتی ہے۔ "نہیں پڑھا' میں کہہ رہی ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اس کتاب کو کبھی بھی نہیں پڑھا!"

"میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ پڑھ چکا ہوں!" کووالینکو اپنی چھتری کو سڑک پر مارتے ہوئے زور سے کہتا ہے:

"اوہ میرے خدا! ارے مینچک! آخر تم اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو؟ یہ تو محض

ایک اصولی گفتگو ہے!''

''اور میں کہتا ہوں کہ پڑھ چکا ہوں!'' کووالینکو اس بار کچھ اور زور سے چلاتا ہے۔

اور گھر پر جب کوئی شخص ملنے آتا تھا تب بھی دونوں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگتے تھے۔ بیچاری وارینکا غالباً اس طرح کی زندگی سے تنگ آ چکی تھی اور بے تاب تھی کہ اس کا اپنا بھی ایک گھر ہو۔ یہی نہیں، عمر کا بھی سوال تھا، کسی معقول شخص کے انتخاب کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ وہ تو کسی سے بھی، یونانی پڑھانے والے ٹیچر سے بھی شادی کر سکتی تھی۔ ویسے سچ پوچھئے تو ہماری لڑکیوں کی اکثریت کا یہی حال ہے، شادی تو کرنی ہی ہوتی ہے اس لئے جو بھی مل جائے غنیمت ہوتا ہے۔ وجہ بہر حال کچھ بھی رہی ہو، وارینکا کے رویے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ ہمارے اس بیلیکوف پر رہ گئی ہے۔

اور بیلیکوف؟ وہ کووالینکو کے ہاں بھی اسی طرح جاتا تھا جیسے ہم سبھوں کے ہاں۔ وہ کووالینکو سے ملنے جاتا اور منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر بیٹھ جاتا۔ وہ یوں ہی بت بنا بیٹھا رہتا جبکہ وارینکا اپنی کالی کالی آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے ''ہوائیں چل رہی ہیں'، گاتی یا پھر اپنے مخصوص انداز میں اچانک زور سے ہنس پڑتی تھی:

''ھا......ھا......ھا''

دل کے معاملات میں خاص طور سے جب شادی کا بھی کچھ قصہ چل رہا ہو، سمجھانے بجھانے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ بیلیکوف کو ہم سب ساتھیوں اور خواتین نے قائل کرنا شروع کیا کہ اب اسے گھر بسانا چاہئے اور یہ کہ اب کی اس زندگی میں شادی کے سوا اور کچھ کرنے کو باقی نہیں۔ ہم سب نے اسے مبارک باد بھی دی اور بڑے سنجیدہ چہروں کے ساتھ مختلف اقوال اس مفہوم کے سنائے کہ شادی انتہائی اہم اقدام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سب کے ساتھ ہی ساتھ وارینکا کوئی ایسی ویسی شکل صورت تو تھی نہیں، اسے تو خوبصورت بھی تصور کیا جا سکتا تھا، ریاستی کونسلر کی بیٹی تھی، اراضی اور اس پر بنے ہوئے مکان کی مالک سے محبت کے ساتھ پیش آ رہی تھی۔ ان سب باتوں نے بیلیکوف کو بوکھلا دیا اور اس نے خود کو سمجھایا کہ شادی کرنا تو دراصل اس کا

فرض ہے۔

''اس شخص سے اس کی چھتری اور ربڑ کے اوپری جوتے چھین لئے جانے کا یہی تو وقت تھا!'' ایوان ایوانچ بول پڑا۔

''یہ تو ناممکن تھا' ناممکن! اس نے وارینکا کا فوٹو اپنی میز پر رکھ لیا تھا' میرے ہاں آ آ کے وارینکا' ازدواجی زندگی اور شادی کی اہمیت پر اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ خاک بھی نہ بدلا۔ اس کے برعکس شادی کرنے کے فیصلے نے لگتا تھا کہ اس کی حالت کچھ اور بھی بگاڑ دی' دبلا ہو گیا' چہرے پر زردی چھا گئی اور اپنے خول کے اندر کچھ اور بھی زیادہ سمٹ گیا''۔

''وروارا ساوویشنا مجھے پسند ہیں'' اس نے اپنی مخصوص خفیف' آڑی ترچھی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر شخص کو شادی کرنی چاہئے۔ لیکن...... یہ معاملہ بالکل اچانک ہی اٹھ گیا' آپ جانتے ہیں نا...... انسان کو کچھ سوچنا بھی تو چاہئے''۔

''اس میں سوچنے کو کیا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''شادی کر لیجئے اور قصہ ختم''۔

''نہیں نہیں! شادی کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے' آدمی کو پہلے اپنے آئندہ فرائض اور ذمے داریوں کا خوب اندازہ لگا لینا چاہئے...... تا کہ بعد میں کہیں کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔ اس معاملے کی فکروں نے میری نیند حرام کر رکھی ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے کچھ کچھ تشویش بھی پیدا ہو چلی ہے۔ بہن بھائی دونوں کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہے' دونوں کا طرز زندگی آپ سمجھ رہے ہیں نا' کچھ عجیب سا ہے پھر یہ کہ لڑکی بھی خاصی تیز طرار ہے۔ فرض کیجئے میں شادی کر لوں اور کسی چکر میں پھنس جاؤں تو''۔

وہ شادی کی باقاعدہ تجویز پیش کرنے کو برابر ٹالتا جا رہا تھا جس سے ہیڈ ماسٹر کی بیوی اور دوسری خواتین کو بڑی مایوسی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آئندہ فرائض اور ذمے داریوں کا اندازہ لگانے میں مصروف تھا' وارینکا کے ساتھ ہر روز غالباً یہ سوچ کر ٹہلنے بھی نکلتا تھا کہ حالات کا تقاضا یہی ہے اور میرے ہاں آ آ کر ازدواجی زندگی کی ساری تفصیلات زیر بحث لاتا تھا۔ زیادہ امکان اسی کا تھا کہ وہ آخر کار شادی کی تجویز پیش کر ہی

دیتا' ان احمقانہ اور غیر ضروری شادیوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیتا جو محض جی او بنے اور کوئی دوسرا بہتر کام نہ ہونے کی بناء پر یہاں ہزاروں کی تعداد میں ہوتی رہتی ہیں لیکن اتنے میں ایک بڑا اسکینڈل کھڑا ہوا۔ اس مرحلے پر آپ کو یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وارینکا کا بھائی کووالینکو بیلیکوف سے تعارف کے دن ہی سے نفرت کرنے لگا تھا اور اسے کبھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا'' وہ اپنے شانے کو اچکاتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ ''آخر لوگ اس چپڑ قناتیے کو' اس گدھے کو جھیلتے کیسے رہتے ہیں؟ ارے صاحبان! آپ یہاں رہتے کیسے ہیں؟ سارا ماحول زہریلا اور دم گھونٹنے والا ہے۔ آپ لوگ خود کو اساتذہ کہتے ہیں؟ آپ تو عہدے کے بھوکے لوگوں کا گروہ ہیں اور بس۔ آپ کا اسکول مرکز علم نہیں کوئی خیراتی ادارہ ہے' یہاں تو پولیس چوکی جیسی متلی پیدا کرنے والی بدبو پھیلی رہتی ہے۔ نہیں صاحبان میں آپ کے ساتھ زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکوں گا۔ اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا جہاں کیکڑے پکڑوں گا اور یوکرینی لڑکوں کو پڑھاؤں گا۔ دیکھ لیجئے گا' میں چلا جاؤں گا اور آپ یہیں اپنے جوڈلیس کے ساتھ ٹھہریئے اور جہنم کا عذاب جھیلتے رہئے!''

کبھی کبھی وہ ہنسنے لگتا تھا' پہلے گہری اور پھر باریک آواز سے ہی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور ہاتھ ہلا کر مجھ سے پوچھتا:

''آخر یہ شخص میرے ہاں کیوں بیٹھا رہتا ہے؟ اسے چاہئے کیا؟ بس بیٹھے تکتا رہتا ہے''۔

اس نے مذاق اڑانے کے لئے بیلیکوف کا ایک نام بھی رکھ چھوڑا تھا: ''خونخوار مکڑ'' ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس سے یہ نہیں کہتے تھے کہ اس کی بہن اسی ''مکڑ'' سے شادی کرنے والی ہے۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی نے ایک بار اشارتاً کہا کہ اس کی بہن اگر بیلیکوف جیسے معتبر اور معزز شخص سے شادی کر لے تو بڑی اچھی بات ہو گی۔ یہ سن کر اس نے بھویں سکوڑیں اور جواب دیا:

''اس معاملے کا مجھ سے کیا تعلق۔ وارینکا کا جی چاہے تو کسی سانپ سے بھی شادی کر سکتی ہے' میری بلا سے' دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا مجھے پسند نہیں''۔

اب ذرا سنئے کہ آگے کیا ہوا۔

کسی مسخرے نے ایک کارٹون بنا ڈالا: بیلیکوف ربڑ کے اوپری جوتے پہنے ہوئے ہے، پتلون کے پائنچے مڑے ہوئے ہیں، سر پر چھتری کھلی ہوئی ہے اور وارینکا اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ساتھ چل رہی ہے۔ نیچے یہ عبارت لکھی تھی: ''محبت میں مبتلا ایسھر وپوس'' چہرہ بیلیکوف کے چہرے سے ہو بہو مشابہت رکھتا تھا۔ مصور نے ضرور کئی راتیں جاگ کے کاٹی ہوں گی کیونکہ لڑکیوں کے اسکول، لڑکوں کے اسکول اور پادریوں کی تربیت کے سبھی اساتذہ اور شہر کے تمام افسروں کو اس کی نقلیں موصول ہوتی تھیں۔ یہ کارٹون بیلیکوف کو بھی ملا اور وہ بے حد پریشان ہوا۔

ایک روز ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ مئی کی پہلی تاریخ تھی اور اتوار کا دن۔ طے یہ پایا تھا کہ تمام طلباء اور اساتذہ اسکول کے سامنے اکٹھا ہوں گے اور وہاں سے پیدل چلتے ہوئے شہر سے کچھ فاصلے پر واقع جنگل میں جائیں گے۔ خیر تو جب ہم باہر نکلے تو اس کے چہرے پر پیلاہٹ چھائی ہوئی تھی اور بہت جھنجھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''دنیا میں بھی کیسے کیسے بے رحم اور خبیث لوگ پائے جاتے ہیں!'' اس نے کہا اور اس کے ہونٹ تھرتھرا اُٹھے۔

میں اس کی حالت پر رنجیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہم لوگ آگے بڑھنے لگے اور تب جانتے ہیں کہ کس کو دیکھا؟ کووالینکو کو جو سائیکل پر سوار تھا اور پیچھے پیچھے وارینکا تھی، سائیکل ہی پر سوار۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، ہانپ بھی رہی تھی لیکن بڑی خوش وخرم نظر آ رہی تھی۔

''ہم آپ سب سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے!'' اس نے پکار کے کہا۔ ''کتنا شاندار موسم ہے! کتنا خوبصورت دن!''

جلد ہی دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بیلیکوف کے چہرے کی پیلاہٹ لاش کے چہرے کی سی زردی میں بدل گئی اور وہ بالکل بدحواس ہو گیا۔ اس نے اچانک ٹھہر کر مجھے تکنا شروع کر دیا۔ ''آخر اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کہیں میری آنکھوں نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا؟'' اسکول ٹیچروں اور خواتین کے لیے سائیکل کی

سواری مناسب ہے کیا؟''

''اس میں کیا قباحت ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''سائیکل پر کیوں نہ سوار ہوں؟''

''لیکن یہ ناقابل برداشت ہے؟'' وہ چیخ اٹھا۔ ''آپ کا یہ اندازِ گفتگو کیسا؟''

اسے بہت زیادہ صدمہ پہنچا تھا اور وہ آگے جانے سے انکار کر کے گھر لوٹ آیا۔

اگلے روز وہ بے چینی سے مسلسل ہاتھ مل رہا تھا، چونک چونک پڑتا تھا اور چہرے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ طبیعت خراب ہے۔ اسکول میں چھٹی ہونے سے پہلے ہی وہ گھر چلا گیا حالانکہ پہلے کبھی بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ دن میں اس نے کچھ بھی نہ کھایا اور شام ہو رہی تھی، تب گرم اور خوشگوار دن ہونے کے باوجود خوب گرم کپڑوں میں ملبوس ہو کے کووالینکو کے ہاں گیا۔

وارینکا تو نہ تھی مگر بھائی گھر ہی پر تھا۔

''تشریف رکھیے'' کووالینکو نے بھویں سکوڑتے ہوئے بے رخی سے کہا۔ وہ سہ پہر کو ذرا دیر سونے کے بعد ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔

چہرہ اب بھی نیند سے بوجھل تھا اور موڈ بہت خراب۔

کوئی دس منٹ خاموش بیٹھے رہنے کے بعد بیلیکوف نے کہنا شروع کیا:

''میں اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ دراصل میں بے حد دکھی ہوں۔ کسی ہجو باز نے ایک خاکہ بنا ڈالا ہے جس میں میرا اور دوسرے فرد کو جو ہم دونوں کو عزیز ہے، مذاق اڑایا گیا ہے۔

میں آپ کو یقین دلانا اپنا فرض تصور کرتا ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی جو قابل مضحکہ ہوتی، اس کے برعکس میرا طرزِ عمل ہمیشہ شائستہ آدمی کا جیسا رہا ہے۔

کووالینکو تیوری چڑھائے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بیلیکوف نے کچھ ٹھہر کے دھیمی، اُداس آواز میں بات جاری رکھی:

''مجھے آپ سے ایک اور بات بھی عرض کرنی ہے۔ میں اس پیشے سے عرصے سے

وابستہ ہوں اور آپ نے ابھی آغاز ہی کیا ہے۔ معمر رفیق کار کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ آپ کو آگاہ کر دوں۔ آپ سائیکل استعمال کرتے ہیں اور کسی ایسے شخص کے لیے جو کم سنوں کو تعلیم دینے کا متمنی ہو' یہ انتہائی قابل ملامت تفریح ہے''۔

''کیوں؟'' کووالینکو نے اپنی گہری آواز میں پوچھا۔

''کیا اس کے لئے میخائیل ساووچ' مزید وضاحت درکار ہے؟ میں تو سمجھتا تھا کہ کسی دلیل یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے نا! ٹیچر اگر سائیکل پر ادھر ادھر گھومتا پھرے گا تو طلباء اپنے سروں کے بل چلنا شروع کر دیں گے۔ سائیکل استعمال کرنے کی اجازت کسی گشتی مراسلے کے ذریعے تو دی نہیں گئی' اس لئے غلط بات ہے۔ کل تو میں بالکل ششدر ہی رہ گیا۔ آپ کی بہن کو دیکھ کر میں بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کوئی نوجوان خاتون یا لڑکی اور سائیکل پر' کیسی لغو بات ہے!''

''آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟''

''میں تو میخائیل ساووچ' آپ کو بس آگاہی دینا چاہتا ہوں۔ آپ نوجوان ہیں ساری زندگی سامنے پڑی ہے۔ آپ کو تو پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہیے لیکن کتنے ناعاقبت اندیش ہیں آپ! کڑھی ہوئی قمیضیں پہنتے ہیں' الٹی سیدھی کتابیں لئے ہوئے سڑکوں پر نظر آتے ہیں اور اب یہ سائیکل۔ آپ اور آپ کی بہن کی سائیکل سواری کا یہ قصہ ہیڈ ماسٹر کے علم میں لایا جائے گا۔ اسکول کے سرپرست کے کانوں تک پہنچے گا...... کیا یہ اچھی بات ہو گی؟''

''میں اور میری بہن سائیکل پر سوار ہوں یا نہ ہوں اس سے کسی دوسرے کا کیا تعلق!'' کووالینکو نے طیش میں آ کر کہا۔ ''اور جو لوگ میرے گھریلو معاملات میں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں انہیں جوتی کی نوک پر مارتا ہوں''۔

بیلیکوف کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ مجھ سے اس تیور سے بات کرتے ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنا سننا نہیں'' اس نے کہا۔ ''میری گزارش ہے کہ افسروں کو میری موجودگی میں کچھ کہتے ہوئے محتاط رہا کیجیے۔ ذمے داروں کا احترام بہرحال لازم ہے''۔

''اور ذمے داروں کے متعلق میں نے کون سی ایسی ویسی بات کہہ دی؟''

کووالینکو نے حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ میں کھرا آدمی ہوں' آپ جیسے شخص سے مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ میں چپڑ قناتیوں سے نفرت کرتا ہوں''۔

بیلیکوف نے گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھا اور چہرے پر خوف کے تاثر کے ساتھ جلدی جلدی اوورکوٹ پہننے لگا۔ زندگی میں کبھی بھی کسی نے اس سے اتنی بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی۔

''جو جی میں آئے کہہ لیجئے'' اس نے زینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک آگاہی دینا ضروری سمجھتا ہوں:

میں نہیں چاہتا کہ ہماری اس گفتگو کو غلط معنی پہنائے جائیں اور اس سے کچھ بُرے نتائج رونما ہوں' اس لئے گفتگو کے لب لباب کے متعلق مجھے ہیڈ ماسٹر کو رپورٹ پیش کرنی پڑے گی...... یہ میرا فرض ہے''۔

''کیا رپورٹ؟ دونا جا کر!''

کووالینکو نے اس کا گریبان پکڑ کے دھکا دیا اور وہ زینے پر کچھ اس حالت میں لڑھکنے لگا کہ اس کے ربڑ کر اوپری جوتے سیڑھیوں سے ٹکراتے جا رہے تھے۔ زینہ خاصا لمبا اور ڈھلوان تھا لیکن بیلیکوف زخمی ہوئے بغیر نیچے تک پہنچ گیا اور کھڑے ہو کر ناک کے بانسے کو چھوا' جیسے یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ عینک تو نہیں ٹوٹی۔ لیکن جس وقت وہ زینے سے لڑھک رہا تھا' اسی وقت وارینکا دوسری دو خواتین کے ساتھ برساتی میں داخل ہوئی تھی اور وہ تینوں نیچے کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں۔

بیلیکوف کے لئے بدترین اذیت یہی تھی۔ ان خواتین کی موجودگی میں ذلیل ہونے سے تو اس کے نزدیک یہ کہیں بہتر ہوتا کہ اس کی گردن اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ جاتیں۔ اسے فکر لاحق ہوئی کہ اب اس واقعے کا سارے شہر کو علم ہو جائے گا' بات ہیڈ ماسٹر تک پہنچے گی' شاید سرپرست کو بھی معلوم ہو جائے۔ توبہ کہیں کوئی آفت نہ نازل ہو جائے! کہیں کسی نے ایک اور کارٹون بنا دیا تب تو اسے استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑے

گا......

بیلیکوف کھڑا ہوا تو واریکا نے اسے پہچان لیا اور وہ واقعے کی اصل نوعیت کا ہلکا سا بھی تصور کئے بغیر یہ سوچ کر کے کہ پاؤں پھسل گیا ہو گیا' اس کے مضحکہ انگیز چہرے' ملگجے اوورکوٹ اور ربڑ کے اوپری جوتوں کو دیکھ کر ہنسی ضبط نہ کر سکی' اپنے مخصوص انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی:

''ھا......ھا......ھا''

یہ گونجتا ہوا شوخ قہقہہ انجام ثابت ہوا' بیلیکوف کی شادی کے قصے ہی کا نہیں بلکہ اس کی زندگی کا بھی۔ واریکا کو وہ پھر کبھی دیکھ نہ سکا۔ اس کے فوٹو کو اس نے گھر پہنچتے ہی اپنی میز پر سے ہٹا دیا اور پھر پلنگ پر لیٹ رہا جہاں سے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

اس واقعے کے تین دن بعد آفاناسی مجھ سے یہ پوچھنے آیا کہ کیا اسے ڈاکٹر کو بلانا چاہئے کیونکہ اس کا مالک عجیب وغریب حرکتیں کر رہا ہے۔ میں بیلیکوف کو دیکھنے گیا۔ وہ اپنے نم گیرپے کے نیچے کمبل اوڑھے بالکل خاموش لیٹا ہوا تھا۔ میرے سوالوں کو جواب وہ بس ''ہاں'' یا ''نہیں'' سے دیتا رہا' اس کے سوا اور کچھ بھی نہ کہا۔ وہ وہیں لیٹا رہتا تھا بلکہ بدمزاج آفاناسی تیوری چڑھائے پلنگ کے گرد پاؤں پٹک پٹک کے چلتا اور گہری ٹھنڈی سانسیں بھرتا اور اس کے جسم سے شراب خانے کی طرح وادکا کی بدبو پھوٹتی رہتی تھی۔

مہینے بھر بعد بیلیکوف چل بسا۔ ہر شخص یعنی دونوں اسکولوں اور پادریوں کی تربیت گاہ کے سارے عملے نے اس کی تدفین میں شرکت کی۔ اب جبکہ وہ تابوت کے اندر لیٹا ہوا تھا تو اس کے چہرے پر نیکی' دلکشی بلکہ شادمانی تک پائی جاتی تھی گویا کہ وہ آخرکار ایک ایسے خول میں بند کر دیئے جانے سے خوش ہو' جس سے کبھی باہر نہ نکلنا پڑے گا۔

جی ہاں! وہ اپنے نصب العین سے ہم کنار ہو چکا تھا:

دن جیسے کہ اس کے اعزاز ہی میں ابر آلود تھا' بوندا باندی بھی ہو رہی تھی اور ہم سب کے جوتوں کے اوپر ربڑ کے جوتے تھے اور ہاتھوں میں چھتریاں......واریکا بھی موجود تھی اور تابت قبر میں اتارا جانے لگے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے

دیکھا ہے کہ یوکرین کی عورتوں یا تو ہنستی ہیں یا روتی ہیں' بیچ کی کوئی کیفیت اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیتیں۔

مجھے اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ بیلیکوف جیسے افراد کو دفن کر کے دلی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن قبرستان سے ہم سب کے سب روتی صورت بنائے ہوئے واپس لوٹے کیونکہ کوئی بھی اپنے اطمینان کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اسی قسم کا اطمینان تھا جیسا مدتوں قبل ہمیں اپنے بچپن میں اس وقت حاصل ہوا کرتا تھا جب بڑی عمر والے کہیں چلے جاتے تھے اور ہم گھنٹے دو گھنٹے باغ میں پوری آزادی کے ساتھ دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ اوہ آزادی! اس کی ہلکی سی جھلک بھی' اس کے حصول کی موہوم سی امید بھی ہماری روحوں کو قوتِ پرواز عطا کر دیتی ہے' ٹھیک ہے نا؟

خیر تو ہم لوگ قبرستان سے خوش وخرم واپس لوٹے۔ مگر بمشکل ایک ہفتہ ہی گزرا ہو گا کہ روزمرہ زندگی' بے رنگ تھکا دینے والی اور بے معنی زندگی دوبارہ اپنے عام ڈگر پر چل نکلی۔ حالات جیسے تھے اس سے بہتر نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے ایک بیلیکوف کو دفن کر دیا تو کیا ہوا' اور بھی تو جانے کتنے ہی لوگ ہیں جو اپنے اپنے خول میں جی رہے ہیں اور جانے کتنے ہی آئندہ جئیں گے''۔

''ہاں واقعی!'' ایوان ایوانچ نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

''اور جانے کتنے ہی آئندہ جائیں گے'' بورکین نے دہرایا۔

ہائی اسکول ٹیچر شیڈ سے باہر نکل آیا۔ اس پستہ قد' فربہ انداز اور بالکل گنجے شخص کی لمبی سیاہ داڑھی تقریباً اس کی پیٹی کے پاس تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کتے بھی باہر نکل آئے۔

''کتنا خوبصورت چاند ہے!'' اس نے دیکھتے ہوئے کہا۔ رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دائیں جانب سارا گاؤں نظر آ رہا تھا جس کی لمبی سڑک کوئی پانچ ورسٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شے گہری' پرسکون نیند کی آغوش میں تھی۔ نہ کہیں کوئی آواز تھی نہ جنبش' یقین ہی نہیں آتا تھا کہ قدرت اتنی پرسکون بھی ہو سکتی ہے۔ چاندنی رات میں ہم کسی گاؤں کی کشادہ سڑک کو اس کے کنارے کنارے واقع مکانوں' خشک گھاس کے

چوٹی دار ڈھیروں اور بید کے خوابیدہ درختوں کو تکنے لگتے ہیں تو ایک زبردست سکون ہماری روحوں پر نازل ہونے لگتا ہے۔

رات کی پرچھائیوں میں ساری محنت مشقت' فکروں اور دکھ درد سے محفوظ گاؤں اپنے سکون میں خاموش اُداس اور خوبصورت نظر آتا ہے' اسے ستارے بھی لطف وعنایت کی نظروں سے دیکھتے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اب دنیا میں بدی کا وجود باقی نہیں رہا' اب سب کچھ خوشگوار ہے۔ بائیں جانب جہاں گاؤں ختم ہوتا تھا' کھیت پھیلے ہوئے تھے جن پر سے گزرتی ہوئی نگاہیں افق تک پہنچ جاتی تھیں اور وہاں بھی ہر شے خاموش اور بے باص وحرکت تھی' سارا میدان چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔

''ہاں واقعی!'' ایوان ایوانچ نے دہرایا۔ ''شہروں میں ہمارا سخت گھٹن والے تنگ کمروں میں رہنا' کاغذات پر بے مقصد قلم گھسیٹنا اور تاش کھیلنا کیا دراصل سیپ کے خول میں زندگی گزارنا نہیں ہے؟ اور یہ حقیقت بھی کہ ہم اپنی ساری زندگی کاہلوں' مقدمے بازی کے شوقین گنواروں اور عقل کی دشمن' کوئی کام نہ کرنے والی عورتوں کے درمیان بسر کرتے ہیں' خود بکواس کرتے اور دوسروں کی بکواس سنتے ہیں' کیا دراصل ہمارے لئے خول کی حیثیت نہیں رکھتی؟ آپ سننے کی زحمت کریں تو میں آپ کو ایک بہت ہی سبق آموز قصہ سنا سکتا ہوں......''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سو جانا چاہئے'' بورکین نے کہا۔

''اس قصے کو کل کے لئے اٹھا رکھئے!''

دونوں شیڈ کے اندر جا کر لیٹ رہے' گھاس سے خود کو ڈھک لیا اور ذرا دیر بعد اونگھنے لگے تو باہر قدموں کی دبی دبی آہٹیں سنائی دیں۔ قریب ہی کوئی چل رہا تھا' چند قدموں کے بعد ٹھہر جاتا تھا اور دوبارہ دبے قدموں سے چلنے لگتا تھا...... کتے غرانے لگے۔

''ماورا ٹہلنے نکلی ہے'' بورکین نے کہا۔

قدموں کی آوازیں پھر نہ سنائی دیں۔

''انسان دوسروں کو جھوٹ بولتے دیکھنے اور سننے پر مجبور ہو'' ایوان ایوانچ نے

کروٹ بدلتے ہوئے کہا" اور پھر ان تمام جھوٹوں کو برداشت کرنے کی بناء پر گدھا کہلائے: انسان اپنی توہین و تذلیل کو سہنے پر مجبور ہو اور احتجاج کرنے اور یہ کہنے کی ہمت نہ کر سکے کہ وہ ایماندار اور آزاد لوگوں کا طرفدار ہے: انسان خود جھوٹ بولے مسکرائے اور وہ بھی محض روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے سر چھپانے کی چھوٹی سی جگہ کے لئے کسی واہیات عہدے اور مرتبے کے لئے۔ نہیں نہیں! یہ زندگی نا قابل برداشت ہے!"

"یہ تو بالکل دوسرا ہی موضوع ہے ایوان ایوانچ" اسکول ٹیچر نے کہا۔ "اب ہمیں سو جانا چاہئے"۔

اور دس ہی منٹ میں بورکین سو گیا۔ لیکن ایوان ایوانچ گھاس پر کروٹیں بدلتا اور ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کے دوبارہ باہر نکل آیا' دروازے کے پاس بیٹھ گیا اور پائپ سلگا لیا۔

چیخوف

گرگٹ

پولیس انسپکٹر اوچومیلوف نیا اوورکوٹ پہنے' ہاتھ میں ایک بنڈل تھامے' بازار کے چوک سے گزر رہا ہے۔ سرخ بالوں والا کانسٹیبل ضبط کیے ہوئے کروندوں سے بالکل اوپر تک بھری ٹوکری اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے...... چوک میں ایک متنفس بھی نہیں نظر آتا...... چھوٹی چھوٹی دوکانوں اور شراب خانوں کے کھلے ہوئے دروازے بہت سے بھوکے جبڑوں طرح خدا کی دنیا کو اداسی کے ساتھ تکتے جا رہے ہیں۔ ان کے قریب کہیں کوئی بھکاری تک نہیں کھڑا ہے۔

''اچھا تو تو کاٹے گا' آوارہ کتے!'' اچانک اوچومیلوف کے کانوں میں آواز پڑتی ہے۔'' ارے لڑکو! جانے نہ دینا اسے! کاٹنے کی آج کل اجازت نہیں ہے۔ پکڑلو کمبخت کو! او!......''

پھر کسی کتے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اوچومیلوف اس جانب نظریں اٹھاتا اور یہ سب دیکھتا ہے۔ تاجر پیچوگین کے عمارتی لکڑی کے گودام سے ایک کتا تین ٹانگوں پر دوڑتا ہوا باہر نکلتا ہے۔ ایک شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے جس کی چھینٹ کی قمیض کلف دار ہے' واسکٹ کے بٹن کھلے ہوئے ہیں اور سارا جسم آگے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ آدمی ٹھوکر کھاتا اور کتے کی پچھلی ٹانگوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' ایک بار پھر کتے کے رونے کی آواز اور یہ چیخ سنائی دیتی ہے۔'' جانے نہ دینا اسے!'' دوکانوں کے اندر سے اونگھتے ہوئے چہرے باہر جھانکتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے گودام کے

قریب بھیڑ سی لگ جاتی ہے' جو لگتا ہے کہ اچانک دھرتی کے اندر سے نکل آئی ہے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ فساد ہو گیا' حضور والا!......'' کانسٹیبل کہتا ہے۔

اوچومیلوف مڑ کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بھیڑ کے پاس پہنچتا ہے۔ اسے احاطے کے گیٹ کے عین سامنے کھلے بٹنوں کی واسکٹ والا متذکرہ بالا شخص کھڑا نظر آتا ہے جو اپنے دائیں ہاتھ کو اٹھائے اس کی ایک انگلی جس سے خون بہہ رہا ہے' لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ اس کے سرشار چہرے پر ''میں تیرا کچومر نکال دوں گا' کمینے!'' لکھا ہوا معلوم ہو رہا ہے اور خود انگلی فتح کے پرچم جیسی نظر آ رہی ہے۔ اوچومیلوف پہچان لیتا ہے کہ وہ شخص سنار خریوکین ہے۔ بھیڑ کے بالکل وسط میں مجرم۔ نوکیلی ناک اور پیٹھ پر ایک زرد دھبے والا سفید چھوٹا سا ''بورزوئی'' کتا۔ اپنی اگلی ٹانگوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ رکھے زمین پر بیٹھا ہوا بری طرح کانپ رہا ہے۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پریشانی اور خوف کی آئینہ دار ہیں۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اوچومیلوف لوگوں کو کندھے سے دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ کر پوچھتا ہے۔ ''اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اپنی انگلی اوپر کیوں اٹھا رکھی ہے؟...... چلایا کون تھا؟''

''ارے حضور! میں تو مسکین شخص کی طرح چپ چاپ چلا جا رہا تھا' خریوکین اپنی مٹھی میں کھانس کر کہنا شروع کرتا ہے۔ ''مجھے یہاں کچھ لکڑی کے متعلق میتری میترچ سے بات کرنی تھی۔ اچانک اس وبال جان نے جس کا میں نے کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا' میری انگلی میں کاٹ کھایا...... معاف کیجئے گا' میں محنت کش ہوں...... میرا پیشہ بڑا پیچیدہ اور دشوار ہے۔ آپ مجھے مالک سے معاوضہ دلانے کی زحمت کریں کیونکہ شاید ہفتے بھر تک میں اس انگلی کو جنبش نہ دے سکوں گا...... قانون بھلا یہ کب کہتا ہے' حضور والا کہ ہمیں خونخوار جانوروں سے بھی نباہ کرنا پڑے گا...... ہر اک کاٹنا شروع کر دے تو جینا مرنا ایک سا ہو جائے گا......''

''ہوں......اچھا' اچھا'' اوچومیلوف کھانستے اور بھوؤں کو پھڑکاتے ہوئے سخت

لہجے میں کہتا ہے۔ ''اچھا' اچھا...... کتے کا مالک کون ہے؟ میں اس معاملے کو چھوڑنے والا نہیں...... میں لوگوں کو کتوں کو آوارہ چھوڑ دینے کا مزہ چکھا دوں گا! ان صاحبان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا وقت آ گیا ہے جو قوانین کو کھیل تماشا سمجھ بیٹھے ہیں! میں اس بدمعاش پر ایسا جرمانہ کروں گا کہ دماغ درست ہو جائے گا' سمجھ جائے گا کہ ایسے ویسے کتوں اور مویشیوں کو ادھر ادھر منڈلانے کے لئے چھوڑ دینے کا انجام کیا ہوتا ہے! میں اس کا دماغ درست کر دوں گا!...... ایلدیرین' وہ کانسٹیبل کی طرف مڑتے ہوئے بات جاری رکھتا ہے۔ ''معلوم کرو کہ کتا کس کا ہے اور ایک بیان مرتب کرو۔ رہا کتا تو اسے فوراً ہی ہلاک کر دیا جانا چاہئے۔ شاید پاگل ہے...... لیکن آخر یہ ہے کس کا؟''

''شاید یہ جنرل ژیگالوف کا ہے'' بھیڑ سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔

''جنرل ژیگالوف! ہوں۔ ایلدیرین' ذرا کوٹ اتارنے میں میری مدد تو کرو...... توبہ' کس قیامت کی گرمی ہے! شاید بارش ہونے والی ہے......'' وہ خریوکین کی طرف مڑتا ہے۔ ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ آخر اس نے تمہیں کاٹ کیسے لیا؟ بھلا یہ تمہاری انگلی تک کیسے پہنچ گیا؟ اتنا ننھا سا کتا اور تم اتنے لمبے تڑنگے آدمی! ضرور تم نے کسی کیل سے انگلی میں خراش ڈالی ہوگی اور پھر تمہیں اس کے لئے معاوضہ ہتھیانے کی سوجھی ہوگی...... میں تم جیسوں کی رگ رگ سے واقف ہوں! بدمعاشوں کی ٹولی!''

''دراصل حضور والا! انہوں نے تفریحاً جلتی سگریٹ سے کتے کی ناک کی نوک جلا دی تھی اور کتے نے انہیں کاٹ لیا' احمق تھوڑی ہے!...... خریوکین کو تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت سوجھتی رہتی ہے' حضور والا!''

''ارے بھینگے! آسمان زمین کے قلابے نہ ملاؤ' تم نے مجھے ایسا کرتے دیکھا تو تھا نہیں' پھر آخر یہ جھوٹ کیوں؟ حضور خود ہی اڑتی چڑیا کو پہچانتے ہیں' جانتے ہیں کہ کون جھوٹ بول رہا ہے' کون سچ...... میں جھوٹ بول رہا ہوں تو مجسٹریٹ مجھ پر مقدمہ چلائے! قانون میں کہا گیا...... اب سب کو برابر حقوق حاصل ہیں...... میرا ایک بھائی خود بھی پولیس میں ہے...... اگر جاننا چاہتے ہو تو......''

''بحث مت کرو!''

''جی نہیں! یہ جنرل صاحب کا کتا نہیں ہے......'' کانسٹیبل بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔ ''ان کے ہاں ایسا کوئی کتا نہیں۔ ان کے تو سبھی کتے شکاری ہیں......''

''تم یہ بات یقینی طور پر جانتے ہو؟''

''بالکل یقینی طور پر، سرکار......''

''یہ میں خود جانتا ہوں! جنرل صاحب کے کتے قیمتی اور عمدہ نسل کے ہیں اور یہ...... ذرا اس پر ایک نظر تو ڈالو! بدصورت، دوغلا کتا!...... آخر کوئی اس طرح کا کتا کیوں پالے؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ اس قسم کا کوئی کتا پیٹرسبرگ یا ماسکو میں دکھائی دے تو جانتے ہو اس کا کیا حشر ہوگا؟ قانون کے متعلق کوئی سوچے گا بھی نہیں اور پل بھر میں اس کا کام تمام کر دیا جائے گا۔ خریوکین، تمہیں اذیت پہنچی ہے اور اس معاملے کو اتنے ہی پر ختم نہیں کیا جا سکتا...... مالک کو سزا ملنی چاہئے! وقت آ گیا ہے کہ......''

''شاید یہ جنرل صاحب ہی کا ہے......'' کانسٹیبل خیال ظاہر کرتا ہے۔ ''اسے صرف دیکھ کر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا...... میں نے ابھی کل ہی جنرل صاحب کے احاطے میں اسی قسم کا ایک کتا دیکھا تھا''

''یقیناً جنرل ہی کا ہے!'' بھیڑ سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ ''ارے ایلدیرین! اوورکوٹ پہننے میں میری مدد تو کرو...... مجھے ہوا کے جھونکے کا احساس ہوا...... میں کپکپا رہا ہوں...... اسے جنرل صاحب کے ہاں لے جاؤ اور وہاں اس کے متعلق دریافت کرو۔ کہنا کہ یہ مجھے ملا ہے اور میں نے اسے بھجوایا ہے...... اور کہنا کہ اسے سڑک پر یوں نہ چھوڑ دیا کریں...... شاید یہ قیمتی کتا ہے اور اگر ہر ظالم سمجھتا ہے کہ وہ اس کی ناک میں سگریٹیں ٹھونس سکتا ہے تو یہ جلد ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ کتا بڑا نازک جانور ہوتا ہے...... اور تم کوڑھ مغز! اپنا ہاتھ نیچے کر لو! اپنی اس واہیات انگلی کی نمائش بند بھی کرو! غلطی تو خود تمہاری ہی ہے!''

''دیکھئے! وہ جنرل صاحب کا رکاب دار آ رہا ہے اسی سے پوچھ لیتے ہیں......''

''ارے او پروخور! ذرا یہاں تو آؤ! اس کتے کو دیکھو.....کیا یہ تمہارے جنرل صاحب کا ہے؟''

''حد ہو گئی! ایسا کتا ہمارے ہاں کبھی بھی نہیں پالا گیا!''

''اب اور زیادہ چھان بین کی کرنے کی ضرورت نہیں'' اوچومیلوف کہتا ہے۔ ''یہ کوئی آوارہ کتا ہے! یہاں کھڑے کھڑے بحث جاری رکھنے کی کوئی تک نہیں.....تم سے کہہ دیا گیا کہ آوارہ ہے تو یہ آوارہ ہی ہے..... مار ڈالو کمبخت کو اور معاملے کو ختم کرو۔''

''یہ ہمارا نہیں ہے'' پروخور اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ ''یہ جنرل صاحب کے بھائی کا ہے جو کچھ ہی روز قبل آئے ہیں! ہمارے جنرل صاحب ایسے کتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کے بھائی جو ہیں نا' تو وہ پسند کرتے ہیں......''

'' کیا کہا' جنرل صاحب کے بھائی آئے ہوئے ہیں؟ ولادیمیر ایوانچ؟'' اوچومیلوف کہہ اٹھتا ہے اور اس کے چہرے پر انتہائی مسرت کی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی ہے۔ ''ذرا دیکھو تو! اور مجھے خبر ہی نہیں تھی! مہمان آئے ہیں؟''

''جی ہاں......!''

''ذرا دیکھو تو ان کا اپنے بھائی سے ملاقات کرنے کو جی چاہتا تھا!.....اور مجھے خبر ہی نہ ہو سکی! تو ان کا ہے یہ کتا؟.....اس کی انگلی میں کاٹ لیا؟ ہا۔ہا۔ہا چلو اٹھو! تھر تھر نہ کانپو! غر۔غر.....ننھا شریر غصے میں ہے.....کیا شاندار کتا ہے؟''

پروخور کتے کو پکارتا اور اسے ساتھ لے کے عمارتی لکڑی کے گودام سے باہر نکل جاتا ہے.....مجمع خریوکین پر ہنس پڑتا ہے۔

''تم اب بھی مجھ سے بچ نہ سکو گے!'' اوچومیلوف اسے دھمکی دیتا ہے اور اپنے اوورکوٹ کو جسم پر خوب لپیٹ کر بازار کے چوک سے گزرنے لگتا ہے۔

چیخوف

نقلی چہرہ

''ایکس'' سوشل کلب میں امدادی کاموں کے لئے فینسی ڈریس رقص یا جیسا کہ اونچے گھرانوں کی نوجوان خواتیں اسے کہنا پسند کرتی تھیں ''بال پاری'' ہو رہا تھا۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ رقص سے دلچسپی نہ رکھنے والے دانش ور جنہوں نے مصنوعی چہرے نہیں لگا رکھے تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ مطالعے کے کمرے میں بڑی سی میز کے گرد بیٹھے اپنا ناکوں اور داڑھیوں کو اخبارات کے اوراق میں چھپائے ہوئے پڑھ رہے تھے' اونگھ رہے تھے اور ماسکو اور پیٹرس برگ کے اخباروں کے نہایت ہی آزاد خیال نامہ نگار خصوصی کے الفاظ میں ''محو خیال'' تھے۔

بال روم سے چار جوڑوں کے بیک وقت رقص والی موسیقی کی لہریں اندر آ رہی تھیں۔ دروازے کے سامنے سے ویٹر پلیٹوں کو کھڑ کھڑاتے ہوئے بار بار تیزی سے گزر رہے تھے۔ لیکن مطالعے کے کمرے کے اندر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ایک دھیمی' دبی دبی سی آواز نے جو چمنی کے اندر سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی اس خاموشی کو توڑ دیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں ہمیں زیادہ سکون میسر ہو سکے گا! آیئے! یہاں آیئے آپ لوگ!''

دروازہ کھلا اور مور کے پروں سے آراستہ ہیٹ اور کوچوان کی وردی میں ملبوس کشادہ شانوں اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک آدمی جس نے مصنوعی چہرہ لگا رکھا تھا' مطالعے کے کمرے میں داخل ہوا۔ مصنوعی چہروں والی دو خواتین اور ٹرے سنبھالے ہوئے ایک

ویٹراس کے پیچھے پیچھے اندر آئے۔ ٹرے پر ایک چھوٹی لیکن کافی کشادہ بوتل تیز شراب کی، تین بوتلیں سرخ ہلکی شراب کی اور کئی گلاس رکھے ہوئے تھے۔

''ہاں یہاں ذرا ٹھنڈک رہے گی'' آدمی نے کہا۔ ''سنو! ٹرے کو میز پر رکھ دو......

مادموزیل، آپ لوگ بیٹھئے نا! Je vous pris a la trimontra اور آپ حضرات، جگہ خالی کیجئے......مخل ہو رہے ہیں!''

وہ کچھ لڑکھڑایا اور ہاتھ مار کے میز پر سے کسی رسالے نیچے گرا دیئے۔

''یہاں پر رکھ دو۔ اور آپ مطالعے کے شائقین صاحبان، یہاں سے چلتے پھرتے نظر آیئے۔ یہ اخبار بینی اور سیاست لڑانے کا وقت تھوڑی ہے......پھینکئے بھی انہیں!''

''ذرا پرسکون رویہ اختیار کیجئے نا'' دانش وروں میں سے ایک نے اپنی عینک کے ذریعے مصنوعی چہرے والے آدمی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ مطالعے کا کمرہ ہے، بار نہیں...... یہ مے نوشی کی جگہ نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ میز مضبوط نہیں ہے یا یہ کہ ہمارے اوپر چھت پھٹ پڑے گی؟ عجیب بات ہے! بہرحال......میرے پاس بحث کرنے کا وقت نہیں۔ اخبارات رکھ دیجئے......جی بھر کر پڑھ چکے ہیں اور آپ لوگوں کو اتنے ہی پر قناعت کرنی ہوگی۔ ویسے بھی آپ صاحبان کی قابلیت کی کوئی تھاہ نہیں، زیادہ پڑھ کر آنکھیں بھی چوپٹ کر لیجئے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ہے سارا قصہ۔''

ویٹر نے ٹرے میز پر رکھ دی اور بازو پر نیپکن ڈالے ہوئے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ نوجوان خواتین فوراً سرخ شراب پر ٹوٹ پڑیں۔

''سوچنے کی بات ہے، ایسے بھی قابل لوگ پائے جاتے ہیں جو اخبارات کو اس قسم کی شرابوں پر ترجیح دیتے ہیں'' مور کے پروں والے آدمی نے اپنے لئے گلاس میں تیز شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، معزز حضرات کہ آپ کو اخباروں سے یہ جو عشق ہے نا تو اس کا سبب یہ ہے کہ مے نوشی کے لئے آپ کی جیب میں پیسے ہی نہیں۔

ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ ہا۔ ہا! ذرا ان لوگوں کو مطالعہ کرتے تو دیکھئے!......اور آپ کے ان اخباروں میں بھلا لکھا کیا ہے؟ ارے اے عینک والے! میں تمہی سے مخاطب ہوں! ہمیں بھی کچھ بتاؤ نا! اب ختم بھی کرو یہ سلسلہ! یہ جھوٹ موٹ کی شان کسی اور کو دکھانا! لو! اس سے تو بہتر ہے کہ جام اٹھاؤ!''

یہ کہہ کر مور کے پر والے نے عینک والے دانش ور کے ہاتھوں سے اخبار چھین لیا۔ آخرالذکر کے چہرے پر سرخی اور پھر زردی چھا گئی اور اس نے سخت حیرت سے دوسرے دانش وروں کی طرف دیکھا جو جواباً اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''آپ آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں' جناب والا!'' وہ چیخ اٹھا۔ ''آپ مطالعے کے کمرے کو گھٹیا شراب خانے میں تبدیل کیے دے رہے ہیں۔ آپ ہلڑ ہنگامے کو' لوگوں کے ہاتھوں سے اخبارات چھین لینے کو شائستہ حرکت تصور کر رہے ہیں۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا! آپ نہیں جانتے کہ آپ کس سے مخاطب ہیں' جناب والا! میں بینک منیجر ژیستیا کوف ہوں!......''

''مجھے خاک بھی پروا نہیں کہ تم ژیستیا کوف ہو۔ اور جہاں تک تمہارے اخبارات کا تعلق ہے ان کی میری نگاہ میں کتنی وقعت ہے اس کا اندازہ تمہیں اس سے ہو جائے گا......'' یہ کہہ کر اس نے اخبار ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

''آخر اس سب کا مطلب کیا ہے' شریف لوگو!'' ژیستیا کوف شدید غصے سے تقریباً بدحواس ہو کر بڑبڑایا۔ ''یہ انتہائی عجیب و غریب بات ہے' یہ......یہ تو سراسیمہ کر دینے والی صورت حال ہے!......''

''انہیں غصہ آ گیا!'' وہ شخص ہنس پڑا۔ ''ہائے ہائے' خوف سے میری جان ہی تو نکل گئی! دیکھئے نا' میرے گھٹنے کیسے تھر تھر کانپ رہے ہیں! خیر معزز صاحبان' ذرا میری بات سنئے۔ میرا آپ لوگوں سے باتیں کرنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے......میں ان نوجوان خواتین کے ساتھ تنہا رہنا چاہتا ہوں' لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں اس لیے مہربانی کر کے کوئی جھگڑا نہ کھڑا کیجئے' شرافت سے چلے جائیے......وہ رہا دروازہ۔ ارے بیلے

بوخین! باہر نکل جاؤ! آخر یہ ناک بھوں کاہے کے لیے سکوڑ رہے ہو؟ میں کہہ رہا ہوں کہ جاؤ تو چلے جاؤ! تیزی سے کھسک لو ورنہ اٹھا کے باہر پھینک دیئے جاؤ گے!"

"کیا کہا؟" یتیموں کی عدالت کے خزانچی بیلیے بوخین نے جس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا' شانے اچکاتے ہوئے پوچھا۔ "میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ ایک بدتمیز شخص کمرے میں گھس آتا ہے اور اچانک جو اس کے منہ میں آتا ہے' بکنا شروع کر دیتا ہے۔"

"کیا کہا تم نے' بدتمیز شخص؟" مور کے پر والا آدمی چراغ پا ہو کے چلایا اور اس نے میز پر اتنے زور سے مکے مارے کہ ٹرے میں رکھے ہوئے گلاس اچھل پڑے۔ "کچھ خبر بھی ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو؟ تم سمجھتے ہوئے کہ محض اس بنا پر کہ میں نے مصنوعی چہرہ لگا رکھا ہے' تم مجھے جو کچھ بھی چاہو کہہ سکتے ہو؟ کتنے تیز مزاج ہو تم بھی! میں تم سے کہہ رہا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ باہر نکل جاؤ! اور یہ جو بینک منیجر ہے نا یہ بھی دفان ہو جائے۔ تم سب کے سب باہر نکل جاؤ' میں نہیں چاہتا کہ ایک بھی بدمعاش کمرے میں باقی رہ جائے! جاؤ' دفان ہو جاؤ!"

"وہ تو ہم ابھی دیکھیں گے!" ژیستیاکوف نے کہا جس کی عینک تک لگتا تھا کہ گھبراہٹ سے پسینے پسینے ہوئی جا رہی ہے۔ "میں آپ کو مزہ چکھا دوں گا! ارے سنو! ذرا میر تشریفات کو تو بلانا!"

چند ہی لمحوں میں سرخ بالوں والا ایک پستہ قد میر تشریفات جس کے کوٹ کے گریبان کی گوٹ پر نیلے ربن کا ایک ٹکڑا لگا ہوا تھا' رقص میں تھک جانے سے ہانپتا ہوا مطالعے کے کمرے میں داخل ہوا۔

"مہربانی کر کے اس کمرے سے چلے جایئے" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ پینے کی جگہ نہیں ہے۔ براہ کرام ناشتے کے کمرے میں چلے جایئے۔"

"اور یہ تم کہاں سے آ ٹپکے؟" مصنوعی چہرے والے نے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں نہیں بلایا تھا' بلایا تھا کیا؟"

"مہربانی کر کے بدتمیزی نہ کیجئے اور یہاں سے چلے جایئے۔"

"تو سنو بھلے آدمی...... میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے رہا ہوں...... تم میر تشریفات ہو یہاں اچھی خاصی اہمیت رکھتے ہو اس لیے ان مسخروں کو نکال باہر کرو۔ یہ میری مادموزیل لوگ جو ہیں نا انہیں ایروں غیروں کی موجودگی بہت کھلتی ہے...... بچاریاں بڑی شرمیلی ہیں اور مجھے اتنا حاصل کرنے کی پڑی ہے جتنا ان پر خرچ کیا ہے انہیں ان کی پیدائشی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں......"

"لگتا ہے یہ اجڈ اتنا بھی نہیں سمجھ پا رہا ہے کہ وہ کسی سٹور خانے میں نہیں ہے!" ژیستیا کوف غصے سے چیخا۔ "یفسرات اسپریدونچ کو بلاؤ!"

"یفسرات اسپریدونچ!" سارے کلب میں آوازیں اٹھیں۔

"یفسرات اسپریدونچ کہاں ہیں؟" پولیس یونیفارم میں ملبوس بوڑھے یفسرات اسپریدونچ نے وہاں پہنچنے میں تاخیر نہیں کی۔

"مہربانی کر کے اس کمرے سے چلے جایئے" اس نے ترش لہجے میں کہا۔ اس کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں باہر نکلی آ رہی تھیں اور خضاب لگی مونچھوں کے سرے پھڑک رہے تھے۔

"ارے تم نے تو مجھے ڈرا دیا!" اس آدمی نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم! تم نے مجھے بری طرح خوف زدہ کر دیا! کیسی مضحکہ خیز صورت ہے خدا مجھے موت دے دے! بلی کے جیسے گل مچھے آنکھیں ہیں کہ باہر نکلی پڑ رہی ہیں...... ہا۔ہا۔ہا!"

"بحث کی ضرورت نہیں!" یفسرات اسپریدونچ غصے کی شدت سے کانپتے ہوئے دھاڑا۔ "چلے جاؤ ورنہ دھکے دے کے باہر نکال دیئے جاؤ گے!"

مطالعے کے کمرے میں شور قیامت گونج اٹھا۔ یفسرات اسپریدونچ اپنے لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ چیخ چیخ کر زمین پر پاؤں پٹخ رہا تھا۔ ژیستیا کوف چلا رہا تھا۔ بیلے بوخین چلا رہا تھا۔ سارے دانش ور چیخ چلا رہے تھے لیکن ان سب کی آوازیں مصنوعی چہرے کی دبی دبی حلق سے نکلتی ہوئی گہری آواز میں ڈوبی جا رہی تھیں۔ اس عام افراتفری کی فضا میں رقص بند ہو گیا اور مہمان بال روم سے نکل کے مطالعے کے

کمرے میں آ گئے۔

یفسرات اسپریدونچ نے ذرا رعب جمانے کے لئے کلب میں اس وقت موجود دوسرے پولیس والوں کو بھی وہیں طلب کر لیا اور خود رپورٹ لکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔

"لکھو، ضرور لکھو!" مصنوعی چہرے والے نے اپنی انگلی قلم کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "اب مجھ بدقسمت کا انجام کیا ہوگا؟ ہائے ہائے بیچارا میرا سر! آخر آپ ایک بے سہارا یتیم کو برباد کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ ہا...... ہا! اچھی بات ہے' لکھیے! رپورٹ تیار ہوگئی؟ سب نے دستخط کر دیئے؟ اب ملاحظہ ہو! ایک' دو' تین!"

وہ اٹھ کے سیدھا کھڑا ہوا اور اپنے مصنوعی چہرے کو اتار ڈالا۔ اس نے اپنے نشے میں دھت چہرے کو بے نقاب کرنے اور اس سے پیدا ہونے والے ردعمل سے محظوظ ہونے کے لئے لوگوں کے چہروں پر نظریں دوڑائیں اور پھر اپنی کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے زوردار قہقہہ بلند کیا۔ اور ردعمل واقعی قابل دید تھا۔ دانش وروں نے انتہائی بوکھلاہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا' ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور ان میں سے بعض اپنی گدیاں کھجلاتے نظر آئے۔ یفسرات اسپریدونچ نے کھنکھار کر کسی ایسے شخص کی طرح اپنا حلق صاف کیا جس سے انجانے میں کوئی نہایت ہی بھیانک غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

یہ سارا ہنگامہ جس نے کھڑا کیا تھا اسے سبھی پہچان گئے۔ وہ تھا خاندانی رئیس اور مقامی لکھ پتی صنعت کار پیاتی گوروف جو اپنے جھگڑالو پن' انسانی ہمدردی اور جیسا کہ مقامی اخبارات آئے دن ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے' تعلیم کے لیے اپنے احترام کی بناء پر شہرت رکھتا تھا۔

"اچھا تو اب آپ لوگ جا رہے ہیں کہ نہیں؟" پیاتی گوروف نے پل بھر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

دانشور منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر پنجوں کے بل چلتے ہوئے مطالعے کے کمرے سے نکل گئے اور پیاتی گوروف نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔

''تجھے معلوم تھا کہ یہ پیاتی گوروف ہیں!'' کچھ دیر کے بعد یفسرات اسپریدونچ
نے مطالعے کے کمرے میں شراب لے جانے والے ویٹر کا شانہ پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے
ہوئے دبی دبی تراش آواز میں کہا۔ ''تو نے کچھ بتایا کیوں نہیں تھا؟''

''مجھ سے نہ بتانے کو کہا گیا تھا!''

''نہ بتانے کو کہا گیا تھا!...... ٹھہر جا' بدمعاش' تجھے مہینے بھر کے لئے جیل پہنچا دوں
گا اور تب اس ''نہ بتانے کو کہا گیا تھا'' کا مطلب تیری سمجھ میں آ جائے گا۔ باہر نکل جا!
اور آپ لوگوں کا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ صاحبان'' اس نے دانش وروں کی طرف
مڑتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ گویا کہ آپ لوگ
مطالعے کے کمرے سے دس منٹ کے لیے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے! یہ واہیات صورت
حال آپ کی پیدا کی ہوئی ہے اور اس سے خود ہی جان چھڑایئے۔ ارے صاحبان'
صاحبان...... آپ لوگوں کے طور طریقے مجھے ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے' خدا کی قسم! ذرا
بھی پسند نہیں!''

دانش ور اداس' پریشان اور نادم ہو کر کلب میں ادھر ادھر ٹہلنے اور ان لوگوں کی طرح
آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے جنہیں احساس ہو کہ بلا سر پر منڈلا رہی ہے...... ان کی
بیویاں اور بیٹیاں یہ سن کر کہ پیاتی گوروف کی ''توہین'' کی گئی ہے اور وہ برا مان گیا ہے۔
خاموش ہو گئیں اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگیں۔ رقص رک گیا۔

''دو بجے رات کو پیاتی گوروف مطالعے کے کمرے سے نشے میں جھومتا' لڑکھڑاتا
باہر نکلا۔ بال روم میں پہنچ کر وہ بینڈ کے پاس بیٹھ گیا' موسیقی کی آواز پر اونگھنے اور کچھ ہی
دیر بعد سر لٹکا کے خراٹے لینے لگا۔

''بند کیجئے' بند کیجئے!'' مجلسی آداب کے سب نگراں موسیقاروں کی طرف ہاتھ
لہراتے ہوئے بول پڑے۔ ''خاموش...... یگور نیلچ کی آنکھ لگ گئی ہے......''

''یگور نیلچ' کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ یہ خادم آپ کو آپ کے دولت کدے
تک پہنچا آئے؟'' بیلے بوخین نے لکھ پتی کے کان کے قریب جھک کر دریافت کیا۔

پیاتی گوروف نے اپنے ہونٹ آگے نکالے جیسے گال پر سے کسی مکھی کو اڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ یہ خادم آپ کو آپ کے دولت کدے تک پہنچا آئے؟'' بیلے بوخین نے ایک بار پھر پوچھا۔

''یا میں لوگوں سے آپ کی بگھی لانے کیلئے کہہ دوں؟''

''ہائیں! کیا؟ ہا! تو یہ تم ہو...... کیا بات ہے؟''

''آپ کو گھر پہنچانا چاہتا ہوں...... آپ کے آرام کا وقت ہو رہا ہے نا......''

''گھر۔ ہاں! میں گھر جانا چاہتا ہوں ...... مجھے گھر لے چلو!''

بیلے بوخین کا چہرہ مسرت و اطمینان سے چمک اٹھا اور وہ سہارا دے کر پیاتی گوروف کو کھڑا کرنے لگا۔ دوسرے دانش ور بھی اپنے چہروں پر مسکراہٹوں کے کنول کھلائے ہوئے دوڑے دوڑے حاضر ہوئے۔ ان سب نے مل کر اس خاندانی رئیس کو اس کے قدموں پر کھڑا کیا اور انتہائی ادب و احتیاط سے سنبھالے ہوئے اس کو بگھی کے پاس لائے۔

''صرف کوئی آرٹسٹ' کوئی بہت ہی باصلاحیت شخص ہی محفل کی محفل کو اس طرح چکمہ دے سکتا تھا'' ژیستیاکوف نے لکھ پتی کو بگھی پر سوار کراتے ہوئے بڑے خوش وخرم لہجے میں کہا۔ ''میری حیرت کا عالم نہ پوچھئے' یگور بیلچ! مجھ سے تو اب تک ہنسی ضبط نہیں ہو رہی ہے...... ہا۔ ہا...... اور ہم سب کے سب کتنا بھڑک اٹھے' بات کا کیسا کیسا بتنگڑ بنایا! یقین مانئے' میں تو کبھی تھیٹر میں بھی یوں جی کھول کر نہیں ہنسا تھا...... کتنی گہرائی اور وسعت تھی آپ کے مذاق میں! یہ ناقابل فراموش شام مجھے زندگی بھر یاد رہے گی!''

پیاتی گوروف کو رخصت کرنے کے بعد دانش وروں نے اطمینان کی سانس لی اور ہشاش بشاش ہو گئے۔

ارے جناب! انہوں نے چلتے چلتے مجھ سے مصافحہ تک کیا۔ ژیستیاکوف نے بڑے فخر و انبساط سے ڈینگ ماری۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے' وہ ناراض

نہیں ہیں......"

"ہمیں امید تو یہی کرنی چاہیے!" یفسرات اسپریدونچ نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"وہ تو بدمعاش اور گھٹیا آدمی ہے پر کیا کیا جائے کہ ہمارا محسن ہے!......اس سے تو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے!......"

سچے لوگ

اولگا ایوانو ونا کے سارے کے سارے دوست اور قریبی واقف کار اس کی شادی میں شریک ہوئے۔

''بھئی ذرا انہیں دیکھئے تو، عجب کشش پائی جاتی ہے ان میں، ہے نا؟'' اس نے شوہر کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ سمجھانے کی بڑی فکر ہے کہ وہ ایسے معمولی آدمی سے جو کسی بھی لحاظ سے ممتاز حیثیت نہیں رکھتا، شادی کرنے پر راضی کیسے ہو گئے۔

اس کا شوہر اوسیپ اسپانچ دیموف ڈاکٹر تھا اور ملازمت میں اپنے مرتبے کے اعتبار سے ٹو لرمشیر کے برابر۔ وہ دو اسپتالوں میں کام کرتا تھا۔ ایک جگہ غیر مقیم معالج کی حیثیت سے اور دوسری جگہ تشریحی لیکچروں کے لئے لاشوں کی چیر پھاڑ کرنے والے کے طور پر روزانہ نو بجے صبح سے دوپہر تک وہ باہری مریضوں کو دیکھتا، اپنے وارڈ کا معائنہ کرتا اور سہ پہر کو گھوڑا ٹرام کے ذریعے دوسرے اسپتال جا کر وہاں مر جانے والے مریضوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرتا۔ نجی پریکٹس سے اس کی آمدنی نہ ہونے کے برابر یعنی کوئی پانچ سو روبل سالانہ تھی۔ اور بس! اس بیچارے کے متعلق بیان کرنے کے لئے اس کے سوا اور تھا ہی کیا؟ دوسری طرف اولگا ایوانو ونا اور اس کے احباب اور واقف کار کسی بھی لحاظ سے معمولی افراد نہ تھے۔ ان میں جو بھی تھا کسی نہ کسی میدان میں ممتاز اور اچھی خاصی شہرت کا مالک تھا اور اگر ابھی تک یہ لوگ مشہور و معروف شخصیت نہیں بن سکے

تھے۔ تب بھی ان کی اٹھان کہہ رہی تھی کہ شاندار مستقبل یقینی ہے۔ ایک اداکار تھا جس کی حقیقی ڈرامائی صلاحیتیں اپنا لوہا منوا چکی تھیں، خوش طبع، ذہین، شائستہ اور خوش خوانی میں ماہر، وہ اولگا ایوانوونا کو فن خطابت کے درس دیا کرتا تھا۔ ایک اوپیرا مغنی تھا، فربہ اندام اور خوش طبع جو ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے اولگا ایوانوونا کو یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹے دے رہی ہے، اگر وہ اتنی کاہلی نہ برتے اور خود کو قابو میں رکھے تو بہت اچھی مغنیہ بن سکتی ہے۔ حلقہ احباب میں کئی مصور بھی شامل تھے جن میں ریابوفسکی خاص طور سے قابل ذکر تھا۔ کوئی پچیس سال کا یہ نہایت وجیہہ و شکیل نوجوان اپنی تصاویر میں مختلف مسائل، جانوروں اور مناظر فطرت کی عکاسی کرتا تھا جو نمائشوں میں دھوم مچا دیتی تھیں۔ اس کی تازہ ترین تخلیق پانچ سو روبل میں فروخت ہوئی تھی۔ وہ اولگا ایوانوونا کے بنائے ہوئے ادھورے خاکوں کو مکمل کرتا اور ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اولگا کی مصوری کبھی بھی گل کھلا سکتی ہے۔ اور ایک وائیلن چیلو نواز تھا جو اپنے وائیلن چیلو کو ''رلا'' سکتا تھا اور کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ جتنی بھی خواتین سے وہ واقف ہے ان میں اس کے ساتھ ساز بجا سکنے کی صلاحیت رکھنے والی صرف ایک ہی ہے.........اولگا ایوانوونا! اور ایک ادیب تھا، نوجوان لیکن خاصا مشہور جو ناولٹ، ڈرامے اور افسانے لکھ چکا تھا۔ اور کون تھا؟ ارے ہاں! ویسلی ویسیچ تھا، خوش لباس زمیندار، کتابوں کے لیے شوقیہ طور پر تشریحی تصاویر بنانے والا، گل بوٹوں اور خاکوں کا خالق جو قدیم روسی طرز اور داستانی رزمیوں کا صحیح معنوں میں دلدادہ تھا۔ وہ کاغذ، چینی کے برتنوں اور مٹی کی رکابیوں پر معجزے دکھا سکتا تھا۔ فنکاروں اور روشن خیالوں کے اس حلقے میں، قسمت کے ان منظور نظر افراد کے درمیان جو بے حد خوش اخلاق اور مہذب ہونے کا باوجود ڈاکٹروں کے وجود کو صرف اپنی علالت کے وقت ہی یاد کرتے تھے اور جن کے کانوں کے لئے دیموف کا نام سیدوروف یا تاراسوف جیسے عام ناموں کے مترادف تھا، دیموف بالکل اجنبی، بے ضرورت اور پستہ قد معلوم ہو رہا تھا حالانکہ وہ بہت ہی طویل قامت اور چوڑے چکلے شانوں والا تھا۔ اس کا فراک کوٹ لگتا تھا کہ کسی اور کے لئے سلا گیا ہے اور داڑھی کسی دوکان دار کی سی معلوم ہوتی تھی۔ یہ الگ

بات کہ وہ کوئی ادیب یا مصور ہوتا تو ہر شخص نے کہا ہوتا کہ وہ اپنی داڑھی کی بنا پر بالکل زولا معلوم ہوتا ہے۔

اداکار نے اولگا ایوانوونا سے کہا کہ وہ اپنے بھورے بالوں اور شادی کے لباس کی بنا پر ہو بہو آلوچے کے کسی درخت جیسی معلوم ہو رہی ہے جبکہ وہ موسم بہار میں نازک اور سفید پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔

''نہیں! ذرا سنئے تو!'' اولگا ایوانوا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آخر یہ سب ہوا کیسے؟ میری بات سنئے! سنئے نا...... دراصل میرے والد اور دیموف ایک ہی اسپتال میں کام کرتے تھے۔ بچارے والد بیمار پڑ گئے تو دیموف نے ان کی ایسی دیکھ بھال شروع کی کہ دن رات ہر وقت ان کے پلنگ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ کیسا زبردست ایثار تھا یہ! سنئے ریابوفسکی!...... اور ادیب' آپ بھی سنئے' آپ کو یہ واقعہ دلچسپ لگے گا۔ ذرا قریب آ جایئے نا! ایسا زبردست ایثار' ایسی پر خلوص ہمدردی! میں بھی رات کے وقت پلک تک نہیں جھپکاتی تھی' والد کے پاس بیٹھی رہتی تھی اور پھر اچانک میں نے طاقتور نوجوان کے دل پر جادو سا کر دیا۔ ہاں! یوں ہی ہوا! میرے دیموف محبت میں ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ کتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں قسمت کے کھیل بھی! خیر تو والد کے انتقال کے بعد دیموف کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتے تھے اور بعض اوقات ہم لوگ گھر کے باہر بھی ملاقات کرتے تھے۔ پھر ایک دن.......... ذرا دیکھئے تو...... کسی غیر متوقع واقعے کی طرح انہوں نے شادی کی تجویز پیش کر دی! ساری رات میں نے روتے روتے کاٹی اور میں بھی محبت میں دیوانی ہو گئی۔ اور اب میں شادہ شدہ عورت ہوں۔ دیموف میں کوئی بڑی مضبوط' بڑی طاقتور چیز پائی جاتی ہے۔ ریچھ کی سی کوئی بات' بتایئے' ہے نا؟ اب تو ان کا صرف تین چوتھائی چہرہ ہی ہمیں دکھائی دے رہا ہے' روشنی ٹھیک نہیں لیکن جب وہ مڑیں اور پورا چہرہ سامنے ہے تو ذرا ان کی پیشانی پر نظر ڈالئے گا۔ اس پیشانی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے' ریابوفسکی؟ ارے دیموف' ہم لوگ آپ کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں!'' اس نے شوہر کو پکارا۔ ''ذرا یہاں آیئے نا! ریابوفسکی کی طرف اپنا پر خلوص

ہاتھ بڑھایئے...... یہ درست ہے۔ آپ دونوں میں دوستی ہونی چاہیے۔"

دیموف نے خوش مزاجی سے بے تصنع مسکراہٹ کے ساتھ ریابوفسکی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا:

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ایک ریابوفسکی نے میرے ساتھ بھی تعلیم مکمل کی تھی۔ وہ آپ کے رشتے دار تو نہیں؟"

اولگا ایوانوونا بائیس سال کی تھی اور دیموف اکتیس سال کا۔ شادی کے بعد ان کی زندگی میں بہار آ گئی۔ اولگا ایوانوونا نے اپنے ڈرائنگ روم کی دیواریں اپنے اور اپنے احباب کے بنائے ہوئے فریم دار اور بغیر فریم کے خاکوں اور تصویروں سے ڈھک دیں اور پیانو اور فرنیچر کے ارد گرد چینی چھتریاں، ایزل، رنگ برنگے پردے، خنجر، چھوٹی چھوٹی مورتیاں اور فوٹو فنکارانہ بے ترتیبی کے ساتھ ڈھیر کر دیئے...... کھانے کے کمرے میں اس نے دیوار پر لوک کتھاؤں اور گیتوں پر مبنی تصاویر، درختوں کی چھال کے جوتے اور درانتیاں لٹکائیں، ایک کونے میں ایک درانتی اور جیلی ساتھ ساتھ رکھی اور اس طرح اسے روسی طرز کا کھانے کا کمرہ بنا دیا۔ خواب گاہ میں کسی غار کا ماحول پیدا کرنے کے لیے اس نے اس کی چھت اور دیواریں سیاہ بانات سے ڈھک دیں، پلنگوں کے اوپر دیسی طرز کا فانوس لٹکایا اور دروازے پر ایک مورتی رکھ دی جو قدیم ہتھیار لئے ہوئے تھی جس کا ایک سرا نیزہ تھا، دوسرا تبر۔ اور ہر ایک نے کہا کہ نوجوان جوڑے نے اپنی رہائش گاہ کو بہت آرام دہ بنا لیا ہے۔

اولگا ایوانوونا ہر روز گیارہ بجے سو کر اٹھتی تھی جس کے بعد پیانو بجاتی یا اگر دھوپ نکلی ہوتی تو کسی روغنی تصویر پر کام کرتی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ یوں گزار کے وہ اپنی درزن کے ہاں جاتی۔ اس کے اور دیموف کے پاس پیسے بہت کم ہوا کرتے تھے، کھینچ تان کے عام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اور بس۔ ان حالات میں اس کے آئے دن نئے نئے لباسوں میں نمودار ہونے اور شاندار نظر آنے کے لئے درزن کو اور خود اسے بھی جانے کیا

کیا جتن کرنے پڑتے تھے۔ بار بار معجزے رونما ہوتے رہتے تھے اور کسی رنگی ہوئی پرانی فراک اور باریک ریشمی جالی اور لیس کے چند ٹکڑوں سے انتہائی دیدہ زیب' رنگین خواب جیسا حسین لباس وجود میں آ جاتا تھا۔ درزن کے ہاں سے اولگا ایوانو ونا عموماً اپنی ایک اداکارہ سہیلی سے ملنے جایا کرتی تھی جہاں وہ چکنی چپڑی باتوں سے کسی پیش کش کی پہلی رات یا کسی کی مالی امداد کے لئے ہونے والے پروگرام کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اداکارہ کے ہاں سے اسے کسی مصور کے اسٹوڈیو یا تصویروں کی کسی نمائش میں جانا ہوتا تھا اور اس کے بعد کسی مشہور و معروف شخصیت کے ہاں' اسے اپنے گھر مدعو کرنے' اس کی گذشتہ آمد کا جواب دینے یا بس یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے لئے۔ وہ جہاں بھی جاتی اس کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا جاتا اور اسے یقین دلایا جاتا کہ وہ نیک' دلکش اور غیر معمولی ہے...... جن کو وہ مشہور اور بڑے لوگ کہا کرتی تھی وہ اس کا اپنوں میں سے ایک' اپنا ہم سر' سمجھ کر خیر مقدم کرتے اور متفقہ طور پر اعلان کرتے کہ وہ اپنی صلاحیتوں' خوش ذوقی اور ذہانت کی بدولت ایک نہ ایک دن ممتاز حیثیت کی مالک ہوگی بشرطیکہ اپنی صلاحیتوں کو اتنی مختلف النوع سرگرمیوں پر ضائع نہ کرے۔ وہ گاتی تھی' پیانو بجاتی تھی' روغنی تصاویر اور چکنی مٹی کی مورتیاں بناتی تھیں' شوقیہ ناٹکوں میں اداکاری کرتی تھی اور یہ سب کچھ محض لشتم پشتم نہیں بلکہ حقیقی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے۔ وہ چراغاں کے لئے فانوس بناتی' کپڑے پہنتی یا یوں ہی کسی کی ٹائی باندھ دیتی۔ جو کچھ بھی کرتی سب پر ایک خاص حسن' سلیقے اور دلربائی کی چھاپ ہوتی تھی۔ لیکن اس کی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ مظاہرہ ممتاز و مشہور افراد سے تڑپڑ دوستی کرنے اور بے تکلف ہو جانے میں ہوتا تھا۔ جیسے ہی کوئی خود کو ذرا بھی ممتاز کرتا یا کسی کے چرچے ہونے لگے ویسے ہی وہ اس شخص سے متعارف ہوتی' فوراً ہی دوستی کر لیتی اور اسے اپنا ہاں مدعو کرتی۔ اس قسم کا ہر نیا تعارف اس کی زندگی میں جشن کا دن ہوتا تھا۔ نام وروں کی وہ پرستش کرتی' ان پر نازاں رہتی اور راتوں کو انہی کے خواب بھی دیکھتی تھی۔ مشہور افراد سے راہ و رسم کی اس کی خواہش ایک ایسی پیاس تھی جو بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی

تھی۔ پرانے احباب غائب ہو جاتے تھے لیکن جلد ہی ان سے بھی اس کا جی اوب جاتا تھا یا ان سے اسے مایوسی ہوتی تھی اور وہ بڑے انہماک کے ساتھ نئے احباب' نئے مشہور و معروف افراد کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی تھی۔ اور جب ایسے نئے احباب مل جاتے تھے تو دوسروں کی متلاشی نظر آتی تھی۔ آخر کیوں؟

چار اور پانچ بجے کے درمیان وہ گھر میں شوہر کے ساتھ ڈنر کھاتی تھی۔ دیموف کی سادگی' عقل سلیم اور خوش طبعی اسے اپنا گرویدہ بنا کر شدید مسرت کے ہیجان میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ بار بار اچھل پڑتی اور شوہر کی گردن میں بانہیں حمائل کر کے اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔

''دیموف' آپ بڑے عقل مند اور بلند خیال آدمی ہیں' اس نے شوہر سے کہا۔'' پر معاف کیجئے گا' آپ میں ایک بڑا بھیانک عیب ہے۔ آرٹ میں آپ سرے سے دلچسپی ہی نہیں لیتے۔ موسیقی اور مصوری کو بالکل نظر انداز ہی کرتے ہیں۔''

''میں انہیں سمجھ نہیں پاتا'' اس نے انکساری سے جواب دیا۔ ''زندگی بھر طبیعیات اور علم طب کے میدان میں کام کیا ہے' دراصل آرٹ سے دلچسپی لینے کا مجھے کبھی وقت ہی نہیں مل سکا۔''

''مگر یہ بڑی بری بات ہے' دیموف!''

''کیوں؟ تمہارے احباب طبیعیات اور علم طب سے بالکل نابلد ہیں اور تم اسے ان کا نقص نہیں تصور کرتیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا میدان ہوتا ہے۔ میں قدرتی مناظر کی تصاویر یا اوپیروں کو نہیں سمجھ پاتا لیکن اس معاملے کو یوں دیکھتا ہوں' اگر کچھ ذہین افراد ان پر کثیر رقوم صرف کرتے ہیں تو یہ چیزیں یقیناً ضروری ہی ہوں گی۔ میں نہیں سمجھتا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں نظر انداز کرتا ہوں۔''

''لایئے! میں آپ کا پرخلوص ہاتھ دبا دوں!''

ڈنر کے بعد اولگا ایوانوونا واقف کاروں سے ملنے جلنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی تھی' اس کے بعد تھیٹر یا کسی کنسرٹ میں چلی جاتی تھی اور نصف شب کے بعد کہیں جا کر

گھر لوٹتی تھی۔ اور یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

ہر بدھ کی شام کو وہ اپنے گھر میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتی تھی۔ ان شاموں کو نہ تاش کھیلا جاتا تھا نہ رقص ہوتا تھا۔ لوگ صرف آرٹس سے محظوظ ہوتے تھے۔ ڈرامہ تھیٹر کا اداکار خوش خوانی کرتا تھا' مغنی گاتا تھا' مصور البموں میں جن کی اولگا ایوانوونا کے پاس افراط تھی' خاکے بناتے تھے' وائیلن چیلو نواز اپنا ساز بجاتا تھا' خود میزبان خاکے اور مورتیاں بناتی' گاتی اور پیانو پر سنگت کرتی تھی۔ خوش خوانی' بجانے اور گانے کے وقفوں میں یہ لوگ ادب' تھیٹر اور آرٹ کے بارے میں باتیں اور بحثیں کرتے تھے۔ مہمانوں میں خواتین نہیں شامل ہوتی تھیں کیونکہ اولگا ایوانوونا ایکٹرسوں اور اپنی درزن کے سوا تمام عورتوں کو گھٹیا اور وبال جان تصور کرتی تھی۔ بدھ کی ایک بھی شام ایسی نہیں ہوتی تھی جب میزبان دروازے پر گھنٹی کی ہر آواز پر چہرے کے فاتحانہ تاثر کے ساتھ یہ کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اچھل نہ پڑتی ہو: ''آ گئے وہ!'' اس ضمیر سے اس کا اشارہ پہلی بار مدعو کئے جانے والے کسی نامور شخص کی طرف ہوتا تھا۔ دیموف کبھی بھی ڈرائنگ روم میں موجود نہیں ہوتا تھا اور کسی کو اس کے وجود کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ لیکن ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کھانے کے کمرے میں جانے کا دروازہ کھلتا' دیموف خوش اخلاقی اور نرمی سے مسکراتا' ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے رگڑتا ہوا دروازہ میں نمودار ہوتا اور کہتا تھا:

''آپ لوگ کھانے پر تشریف لائیے!''

سب لوگ ایک قطار کی شکل میں کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے اور ان کی آنکھوں کا ہر بار وہی چیزیں خیر مقدم کرتیں: کستورے کی ایک ڈش' ران کے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا' سارڈین مچھلیاں' پنیر' اسٹرجن مچھلیوں کے نمک پڑے ہوئے انڈے' سرکے میں پڑی ہوئی' سانپ چھتریاں' ہلکی شراب سے بھری شیشے کی دو صراحیاں اور وادکا۔

''میرے پیارے MAITRE D'HOTEL'' اولگا ایوانوونا انتہائی مسرت کے جوش میں اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے جکڑ کر کہتی تھی۔ ''آپ واقعی بے حد دلکش ہیں! ذرا آپ لوگ ان کی پیشانی کو تو دیکھئے! دیموف' ہم لوگ کی طرف رخ تو کیجئے!

دیکھئے آپ لوگ' بنگال کے شیر جیسا چہرہ اور اس پر نرمی اور دلکشی ایسی جیسے کسی ہرنی کا ہو! کتنے پیارے لگتے ہیں!''

مہمان کھانے کی طرف متوجہ ہوتے اور دیموف پر نظریں ڈال ڈال کر سوچتے: '' واقعی اچھے آدمی ہیں۔'' لیکن جلد ہی اسے بھول بیٹھتے اور تھیٹر اور موسیقی اور آرٹ سے متعلق اپنی باتیں جاری رکھتے۔

نوجوان جوڑا خوش تھا' زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی۔ ہنی مون کا تیسرا ہفتہ البتہ کوئی خاص ہنسی خوشی سے نہ گزرا بلکہ پریشان کن ثابت ہوا۔ دیموف کو اسپتال میں حمرہ مرض لگ گیا' اسے چھ دنوں تک صاحب فراش رہنا اور اپنے خوبصورت کالے بالوں کو بالکل جڑوں کے پاس تک ترشوا دینا پڑا۔ اولگا ایوانوونا پلنگ کے پاس بیٹھی زاروقطار آنسو بہاتی رہی' لیکن دیموف کی حالت ذرا بہتر ہوگئی تو اس نے شوہر کے صفاچٹ سر پر سفید رومال باندھا اور کسی عرب بدو کے روپ میں اس کی تصویر بنانے بیٹھ گئی۔ صحت یاب ہوکر وہ کام کرنے کے لئے پھر اسپتال جانے لگا لیکن تین دنوں کے بعد ہی نئی مصیبت نازل ہوگئی۔

''میری قسمت ہی کھوٹی ہے' اولگا'' اس نے ایک روز ڈنر کے دوران کہا۔ '' آج میں نے چار پوسٹ مارٹم کئے اور اپنی دو انگلیاں کاٹ لیں۔ مجھے اس کا پتا گھر واپس لوٹنے کے بعد ہی چل سکا۔''

اولگا ایوانوونا تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ وہ مسکرا دیا' کہنے لگا کہ یہ تو معمولی بات ہے اور پوسٹ مارٹم کے دوران اکثر اس کے ہاتھ کہیں نہ کہیں کٹ جاتے ہیں۔

''میں خیالوں کی رو میں بہہ جاتا ہوں' اولگا اور ویسے مزاجاً بھی کھویا کھویا رہتا ہوں۔''

اولگا ایوانوونا بڑی پریشانی کے ساتھ خون میں زہر پھیل جانے کا انتظار کرنے لگی' ہر رات کو دعا مانگتی کہ مصیبت سر سے ٹل جائے اور یہی ہوا بھی۔ اور پہلے جیسی پرمسرت' پرسکون زندگی' آلام و افکار سے یکسر خالی زندگی دوبارہ شروع ہوگئی' حال شاندار تھا اور

جلد ہی بہار آنے کو تھی‘ ان دونوں پر دور سے مسکراتی اور دامن میں بے شمار مسرتیں لاتی ہوئی بہار۔ مسرتوں کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے کو تھا۔ اپریل‘ مئی اور جون تینوں مہینے ماسکو سے کافی فاصلے پر ''داچا'' میں چہل قدمیوں‘ مصوری‘ مچھلی کے شکار اور بلبلوں کے گیتوں کے درمیان گزرنے والے تھے اور جولائی سے خزاں تک کا زمانہ دریائے والگا کے کنارے مصوروں کی سیروگشت کے لئے وقف تھا جس میں اولگا ایوانو ونا کو مصوروں کے حلقے کی مستقل رکن کی حیثیت سے شرکت کرنی تھی۔ اس نے اپنے لئے موٹے کپڑے کے دو سفری لباس سلوائے تھے اور مختلف رنگ‘ ڈھیروں برش‘ کینوس اور رنگ ملانے کی ایک نئی تختی بھی خرید چکی تھی۔ اس کی مصوری کی رفتار ترقی کا جائزہ لینے کے لیے ریابوفسکی تقریباً ہر روز اس کے ہاں آتا تھا۔ وہ ریابوفسکی کو اپنی تخلیقات دکھاتی تو وہ اپنے ہاتھوں کو جیبوں میں ٹھونس لیتا‘ ہونٹوں کو سختی سے بھینچتا‘ ناک بھوں چڑھاتا اور کہتا تھا:

''ارے رے...... یہ بادل تو چیخ رہا ہے۔ یہ شام کی روشنی تھوڑی ہے۔ پیش منظر ذرا گڑبڑ سا ہے اور کسی چیز کی۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میرا مطلب کیا ہے۔ کمی محسوس ہوتی ہے...... آپ کی یہ جھونپڑی ایسی لگتی ہے جیسے اسے دونوں طرف سے کس کے دبا دیا گیا ہو اور بیچاری دردناک طور پر رو رہی ہے...... گوشے کو ذرا زیادہ تاریک کر دیجئے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ تصویر زیادہ بے جان نہیں ہے...... میں مطمئن ہوں۔''

اور اس کا اندازِ گفتگو جتنا مبہم ہوتا تھا‘ اتنی ہی آسانی سے اولگا ایوانو ونا سمجھ جاتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

...

ایسٹر کے بعد کے ساتویں اتوار کے اگلے روز دیموف نے سہ پہر کو بیوی کیلئے داچے لے جانے کی خاطر مٹھائیاں اور کھانے کی کچھ دوسری چیزیں خریدیں۔ اولگا کو اس نے کوئی پندرہ دنوں سے نہیں دیکھا تھا اور اس کی یاد میں بری طرح تڑپ رہا تھا۔ ٹرین کے سفر کے دوران اور اس کے بعد جھاڑیوں کے بن میں اپنے داچے کو تلاش کرتے

وقت بھوک کی شدت سے اس کا برا حال تھا اور وہ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان سے رات کا کھانا کھانے اور پھر بستر میں گھس جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے بنڈل کو جو اسٹرجن مچھلی کے انڈوں' پنیر اور سکھائی ہوئی مچھلیوں پر مشتمل تھا' دیکھ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

آخر کار جب اسے داچے کی تلاش کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تو آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ بوڑھی نوکرانی نے اسے بتایا کہ مالکن گھر میں نہیں ہیں لیکن شاید جلد ہی واپس آ جائیں گی۔ نیچی چھتوں' لکھنے کے کاغذ سے ڈھکی ہوئی دیواروں اور گڑھوں سے بھرے ہوئے ناہموار فرشوں والا یہ انتہائی غیر دلکش داچا صرف تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں پلنگ بچھا ہوا تھا' دوسرے میں کینوس' مصوری کے برش' گندے کاغذ کا ایک ٹکڑا اور کرسیوں اور کھڑکیوں کی سلوں پر مردوں کے کوٹ اور ہیٹ رکھے ہوئے تھے اور تیسرے میں دیموف کو تین اجنبی نظر آئے۔ دو مرد سانولے اور دڑھیل تھے اور تیسرا صاف منڈی ہوئی داڑھی مونچھوں والا بظاہر کوئی اداکار معلوم ہو رہا تھا۔ میز پر رکھے ہوئے سماوار سے بھاپ نکل رہی تھی۔

"کہیے! آپ کو کیا چاہیے؟" اداکار نے دیموف کو غیر دوستانہ انداز سے دیکھتے ہوئے گہری آواز میں پوچھا۔ "اولگا ایوانوونا سے ملنا ہے؟ ذرا انتظار کیجیے۔ وہ آتی ہی ہوں گی۔"

دیموف بیٹھ کے انتظار کرنے لگا۔ سانولے آدمیوں میں سے ایک نے اسے نیم خوابیدہ سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چائے انڈیلی اور پوچھا:

"چائے پئیں گے؟"

دیموف بھوکا بھی تھا' پیاسا بھی لیکن اس نے اس خیال سے کہ بھوک مر نہ جائے' چائے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور ایک جانی پہچانی ہنسی کی آواز۔ دروازہ بھڑ سے کھلا اولگا ایوانوونا جس کے سر پر چوڑے چھجے کا ہیٹ تھا اور ہاتھ میں ڈبا' تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ دیابوفسکی جس کا چہرہ تمتمایا

ہوا تھا اور بڑے جوش و خروش میں معلوم ہوتا تھا' بڑی سی چھتری اور تہہ ہو جانے والا اسٹول اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا۔

"دیموف!" اولگا ایوانوونا جس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا' زور سے چلائی۔

"دیموف!" اس نے شوہر کے سینے پر سر اور دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے دہرایا۔ "تو یہ آپ ہیں! اتنے زیادہ دنوں سے آپ آئے کیوں نہیں تھے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟"

"میرے پاس وقت ہی کہاں تھا؟ ہمیشہ تو مصروف رہتا ہوں اور کبھی فرصت بھی ملتی ہے تو کچھ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ مناسب ٹرین نہیں ملتی۔"

"اوہ' کتنی خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کے! رات بھر' جی ہاں! رات بھر آپ ہی کے خواب دیکھتی رہی' ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ بیمار نہ ہوں' کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ اوہ! کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کتنے پیارے ہیں' کتنا اچھا ہوا جو آپ آ گئے! آپ میرے نجات دہندہ ہیں! صرف آپ ہی مجھے بچا سکتے ہیں! کل یہاں نہایت ہی انوکھی شادی ہونے جا رہی ہے" اس نے ہنس ہنس کے شوہر کی ٹائی دوبارہ باندھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اسٹیشن کے ٹیلی گراف آپریٹر کی شادی ہو رہی ہے' نام اس کا چیکلدییف ہے۔ صورت اچھی پائی ہے' بے وقوف نہیں اور آپ جانتے ہیں' اس کے چہرے میں کوئی بڑی طاقتور' ریچھ کی سی کوئی بات پائی جاتی ہے...... وہ تو کسی نوجوان وارنگی کی تصویر کیلئے ماڈل کا بھی کام دے سکتا ہے۔ گرمیوں میں یہاں آنے والے ہم سب لوگ اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور عزت کی قسم کھا کے وعدہ کیا ہے کہ اس کی شادی میں شریک ہوں گے...... بچارا مفلسی اور تنہائی کا مارا ہوا ہے' شرمیلا ہے اور کسی طرح سے ہمارا انکار گناہ ہوگا' گناہ۔ ذرا تصور تو کیجئے' شادی کی رسم عبادت کے فوراً ہی بعد انجام دی جائے گی اور گرجے سے سارے کے سارے لوگ سیدھے دلہن کے گھر جائیں گے...... درختوں کا جھنڈ' طائروں کے نغمات' گھاس پر دھوپ اور گہرے سبز رنگ کے پس منظر میں ہم سب رنگین ملبوسات میں۔ کیسا انوکھا سماں ہوگا۔ باطنی دنیا کی عکاسی کرنے والے فرانسیسی مصوروں کی سی تخلیق جیسا۔ لیکن دیموف' ذرا سوچئے تو' میں گرجا جاؤں گی تو کیا پہن

کے؟'' اولگا ایوانوونا نے چہرے پر اداسی طاری کرتے ہوئے کہا۔ '' یہاں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں' واقعی کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی خاص لباس ہے' نہ پھول ہیں' نہ دستانے...... آپ کو مجھے اس افسوس ناک صورت حال سے بہر حال نجات دلانی ہو گی! اس وقت آپ کی آمد کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر چاہتی تھی کہ آپ مجھے نجات دلائیں۔ میری کنجیاں لے لیجئے' ڈارلنگ اور گھر جا کے کپڑوں کی الماری سے میرا گلابی لباس لے آیئے...... آپ تو اسے جانتے ہیں' بالکل سامنے ہی لٹکا ہے......اور صندوقوں کے کمرے میں آپ کو فرش پر دفتی کے دو صندوق نظر آئیں گے۔ جب آپ اوپر والے صندوق کو کھولیں گے تو بس باریک ریشمی جالیاں' جالیاں' جالیاں ہی نظر آئیں گی یا پھر طرح طرح کے کپڑوں کے بچے کھچے ٹکڑے اور ان کے نیچے پھول۔ سارے پھولوں کو بہت احتیاط کے ساتھ نکال لیجئے گا اور کوشش کیجئے گا میرے محبوب کہ ان پر سلوٹیں نہ پڑنے پائیں۔ بعد میں انہی میں سے کچھ کا انتخاب کرلوں گی......اور ہاں! میرے لئے ایک جوڑا دستانے خرید لیجئے گا۔''

'' بہت اچھا!'' دیموف نے کہا۔ '' میں کل واپس جاؤں گا اور یہ چیزیں بھجوا دوں گا۔''

'' کل؟'' اولگا ایوانوونا نے اس کی طرف شدید اضطراب سے تکتے ہوئے دھرایا۔ '' کل تو آپ کا وقت پر پہنچ جانا ممکن ہی نہ ہو گا! کل پہلی ٹرین نو بجے روانہ ہوتی ہے اور شادی گیارہ بجے ہو گی۔ نہیں! میری جان! آپ کو آج ہی جانا چاہئے' جانا ہی ہو گا! کل آپ خود نہ آسکیں تو کسی کے ہاتھ ساری چیزیں بھجوا دیجئے گا......اچھا تو اب جائیے......ٹرین یہاں بس پہنچنے ہی والی ہے۔ دیر نہ کیجئے' پیارے۔''

'' بہت اچھا۔''

'' کیا کہوں کہ مجھے آپ کے جانے سے کیسی کوفت ہو رہی ہے!'' اولگا ایوانوونا نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ '' میں بھی کیسی احمق تھی کہ ٹیلی گراف آپریٹر سے وعدہ کر لیا!''

دیموف نے ایک گلاس چائے جلدی جلدی حلق میں انڈیلی' ایک کرارا بسکٹ اٹھا کے انکساری کے ساتھ مسکرایا اور اسٹیشن کیلئے روانہ ہو گیا۔ اسٹرجن مچھلی کے انڈے' پنیر اور سکھائی ہوئی مچھلیاں دونوں سانولے آدمیوں اور فربہ انداز اداکار کے پیٹ میں پہنچ گئیں۔

جولائی کی ایک خاموش چاندنی رات میں اولگا ایوانوونا والگا کے ایک اسٹیمر کے عرشے پر بیٹھی باری باری سے پانی اور دریا کے خوبصورت کنارے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پہلو میں کھڑا ہوا ریابوفسکی اسے بتا رہا تھا کہ پانی کی سطح پر جو کالی کالی پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں یہ پرچھائیاں نہیں بلکہ ایک خواب ہیں نیز یہ کہ اس طلسمی اور تابناک پانی' اس لامتناہی آسمان اور دریا کے ان مغموم کناروں کے درمیان' اس ماحول میں جہاں یہ ساری چیزیں ہم سے ہماری زندگیوں کے ہیچ ہونے کی اور کسی ارفع تر' کسی جاوداں اور مسعود شے کے وجود کی باتیں کر رہی ہیں' سب کچھ بھول بیٹھنا' مر جانا اور ایک یاد بن کر رہ جانا کہیں بہتر ہو گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ماضی حقیر اور غیر دلچسپ تھا' مستقبل کورا ہو گا اور یہ دوبارہ کبھی نہ آنے والی مقدس رات بھی جلد ہی ختم ہو جائے گی' دوام کا جزو بن جائے گی۔ تو پھر آخر زندہ کیوں رہا جائے؟

اور اولگا ایوانوونا نے باری باری سے ریابوفسکی کی آواز اور رات کے سناٹے کو سنا اور اپنے آپ سے کہا کہ وہ جاوداں ہے' کہ وہ کبھی نہ مرے گی۔ طرح طرح کے رنگ بدلتا ہوا پانی جیسا کہ اس نے زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ آسمان' دریا کے کنارے' سیاہ پرچھائیاں اور اس کی روح کو معمور کرتی ہوئی بے پایاں مسرت۔ ساری چیزوں نے اس سے کہا کہ وہ ایک دن عظیم مصور ہو گی اور یہ کہ دوریوں سے آگے' چاندنی رات سے آگے کہیں لامحدود خلا میں اس کی کامیابی' شہرت اور عوام کی محبت اس کی منتظر ہیں...... پھر جب وہ ذرا دیر تک پلکیں جھپکائے بغیر دور خلا میں تکتی رہی تو اسے ایسا لگا کہ وہ ہجوموں اور روشنیوں کو دیکھ رہی ہے' تقریبی موسیقی اور پرجوش افراد کے داد و تحسین

کے نعروں کو سن رہی ہے' وہ خود سفید لباس زیب تن کیے ہوئے ہے اور اس پر چاروں طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ سے یہ بھی کہا کہ اس کے پہلو میں عرشے کی ریلنگ پر جھکا ہوا ایک حقیقی عظیم شخص' ایک جینیس' خود خدا کے منتخب کردہ افراد میں سے ایک فرد کھڑا ہے......اس کی اب تک کی تمام تخلیقات شاندار' جدید اور غیر معمولی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کی غیر معمولی صلاحیتوں میں پختگی آ جائے گی تب وہ جو کچھ تخلیق کرے گا وہ اور بھی زیادہ موثر اور لامحدود طور پر عظیم ہو گا اور یہ سب کچھ اسکے چہرے میں' اس کے اپنے اظہار کے انداز اور فطرت سے متعلق اس کے رویے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پرچھائیوں' شام کے رنگوں اور چاندنی رات کے حسن کو بیان کرنے کی اس کی اپنی ایک مخصوص زبان ہے اور فطرت پر اس کے اختیار کی دلکشی تقریباً ناقابل مزاحمت ہے۔ اور وہ خوبصورت بھی ہے' اس میں نیاپن بھی پایا جاتا ہے اور اس کی آزاد' بے فکری اور دنیاوی بندھنوں سے پاک زندگی کسی طائر کی زندگی جیسی ہے۔

''سردی بڑھ چلی ہے'' اولگا ایوانوونا نے کہا اور کانپ اٹھی۔ ریابوفسکی نے اسے اپنی برساتی اوڑھاتے ہوئے اداس لہجے میں کہا:

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پوری طرح آپ کے بس میں ہوں۔ غلام جیسی حالت ہو رہی ہے میری تو۔ آپ کی دلکشی اور دلربائی میں آج اتنا زیادہ اضافہ کیسے ہو گیا؟''

وہ اولگا ایوانوونا کو مسلسل تکے جا رہا تھا' چہرے سے نظریں ہی نہیں ہٹا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی وحشت برس رہی تھی کہ اولگا ایوانوونا کو اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔

''میں آپ کی محبت میں پاگل ہوا جا رہا ہوں...'' اس نے سرگوشی کی اور اس کی سانس کے لمس کو اولگا ایوانوونا نے اپنے رخسار پر محسوس کیا۔ ''صرف آپ کے کہنے کی دیر ہے اور میں جان دے دوں گا' مصوری کو ٹھکرا دوں گا...'' اس نے جذبات کی

شدت سے دھیرے سے کہا۔ ''مجھ سے محبت کیجئے' محبت کیجئے......''

''ایسی باتیں نہ کیجئے'' اولگا ایوانو ونا نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈر لگتا ہے۔ اور دیموف؟''

''دیموف سے کیا مطلب؟ آخر دیموف کیوں؟ دیموف سے مجھے کیا سروکار؟ والگا' ماہتاب' حسن' میری محبت' میری مسرت۔ اس سب میں دیموف کون ہوتے ہیں......اوہ! مجھے کچھ بھی نہیں معلوم...... مجھے ماضی کی حاجت نہیں' مجھے صرف ایک لمحہ عنایت کر دیجئے......بس ایک لمحہ مختصر!''

اولگا ایوانو ونا کے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ اس نے اپنے شوہر کے متعلق سوچنے کی کوشش کی لیکن اسے اپنا سارا ماضی' اپنی شادی' دیموف' اپنی بدھ کی شامیں۔ سب کچھ حقیر' غیر اہم' بے کیف' بے مصرف اور دور' بہت دور معلوم ہوا......اس نے سوچا ٹھیک ہی تو ہے' دیموف سے کیا مطلب؟ آخر دیموف کیوں؟ دیموف سے اسے کیا سروکار؟ اس قسم کے آدمی کا کیا واقعی کہیں وجود بھی ہے؟ کیا وہ محض ایک خواب ہی نہیں؟

''دیموف کو جو مسرت مل چکی ہے وہ ان کے جیسے کسی معمولی آدمی کے لئے بہت کافی ہے'' اس نے ہاتھوں سے چہرے کو ڈھکتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ''لوگ وہاں مجھے برا بھلا کہنا چاہیں تو کہیں' مجھ پر لعنت بھیجیں' میں خود کو تباہ کر لوں گی' ہاں محض لوگوں کو نیچا دکھانے کے لئے خود کو تباہ کر لوں گی......انسان کو ایک بار ہر چیز کا تجربہ کرنا چاہئے۔ اوہ خدا! کتنی مہیب بات ہے اور کتنی خوبصورت!''

''اچھا پھر؟ اچھا پھر؟'' مصور نے اسے اپنی بانہوں میں لینے اور اس کے ہاتھوں کو جن سے وہ اسے الگ دھکیلنے کی ہلکی سی کوشش کر رہی تھی' بے تابی سے چومتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا۔ ''تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ کرتی ہو نا؟ اور' کیا شاندار رات ہے' کتنی خوبصورت رات ہے!''

''ہاں! کیا شاندار رات ہے!'' اولگا ایوانو ونا نے اس کی آنکھوں میں جو آنسوؤں

سے چمک رہی تھیں، جھانکتے ہوئے سرگوشی کی اور پھر تیزی سے نظریں پھیر کر اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

"ذرا سی دیر میں ہم لوگ کیشما پہنچ جائیں گے" عرشے کے دوسرے رخ سے کسی کی آواز سنائی دی اور پھر بھاری قدموں کی آہٹیں۔ یہ ناشتے کے کمرے کا آدمی تھا جو ادھر سے گزر رہا تھا۔

"ذرا سنئے!" اولگا ایوانوونا نے فرط انبساط سے ہنستے اور روتے ہوئے اسے پکارا۔ "ہمیں کچھ شراب دے دیجئے۔"

مصور نے جس کا چہرہ اضطراب کے باعث زرد پڑ گیا تھا، ایک بنچ پر بیٹھ کر اولگا ایوانوونا کو محبت بھری شکر گزار نگاہوں سے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں اور افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"میں تھک گیا۔"

اور اس نے اپنا سر ریلنگ پر رکھ دیا۔

دو ستمبر کو ہوائیں نہیں چل رہی تھیں، دن گرم لیکن کہر آلود تھا۔ صبح کو دریائے والگا پر ہلکا کہر امنڈلا رہا تھا اور نو بجے کے بعد بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مطلع صاف ہو جانے کا ذرا بھی امکان نہیں آ رہا تھا۔ ناشتے پر ریابوفسکی نے اولگا ایوانوونا سے کہا کہ مصوری سب سے زیادہ صبر آزما اور تھکا مارنے والا فن ہے۔ کہ وہ مصور نہیں ہے کہ صرف عقل کے اندھے ہی اس کی صلاحیتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اس نے خفیف سا اشارہ دیئے بغیر ہی اچانک چاقو اٹھا کر اپنے بنائے ہوئے نہایت کامیاب خاکے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ کھویا کھویا کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر دریا کو دیکھنے لگا۔ والگا اپنی چمک دمک سے محرومی کے بعد اب دھندلا بے حس اور سرد سا لگ رہا تھا۔ ہر شے پکار پکار کے کہہ رہی تھی کہ اداس اور بے رنگ خزاں آنے کو ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں کناروں کے ہریالی کے قالینوں، آفتاب کی شعاعوں کے ہیرے جیسے عکسوں صاف و

شفاف نیلگوں وسعتوں اور فطرت کے تمام شاندار مناظر کو والگا سے لے کر اگلے موسم بہار تک کے لئے کسی صندوق میں بند کر دیا ہو اور اس کو اوپر اڑتے ہوئے کوے چھیڑ خانی کر رہے ہوں۔ ''برہنہ! برہنہ!'' ریابوفسکی نے ان کی کائیں سنی اور اپنے آپ سے کہا کہ مصور کی حیثیت سے وہ مر چکا ہے' اپنی صلاحیتیں کھو چکا ہے اور یہ کہ دنیا کی ہر شے رسمی۔ اضافی اور احمقانہ ہے نیز یہ کہ اسے اس عورت کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہئے تھے...... مختصر یہ کہ وہ بری طرح مایوس اور بددل ہو رہا تھا...... اولگا ایوانوونا اوٹ کے دوسری طرف پلنگ پر بیٹھی سن جیسے رنگ کے اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی' تصور ہی تصور میں خود کو اپنے ڈرائنگ روم' خواب گاہ اور شوہر کے مطالعے کے کمرے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے تصور نے اسے تھیٹر پہنچایا' درزن کی دوکان اور اس کے مشہور و معروف دوستوں کے ہاں لے گیا۔ اس لمحے وہ لوگ کیا کر رہے ہوں گے؟ کبھی ان لوگوں کو اس کا خیال بھی آتا ہوگا؟ سیزن شروع ہو چکا تھا اور یہ اس کے ہاں ہر بدھ کی شام کو ہونے والی پارٹیوں کے متعلق سوچنے کا وقت تھا۔ اور دیموف؟ پیارا دیموف! بیچارا کتنی خاکساری' کیسی بچگانہ اداسی کے ساتھ اپنے خطوں میں سے اس سے گھر لوٹ آنے کی التجا کرتا تھا۔ وہ ہر ماہ پچھتر روبل بھیجتا تھا اور جب وہ لکھتی تھی کہ اس نے مصوروں سے سو روبل قرض لے لئے ہیں تو مزید سو روبل بھیج دیتا تھا۔ کیسا نیک اور دریادل آدمی تھا! سفر اولگا ایوانوونا کو ہلکان کر چکا تھا' اس کا جی اوب رہا تھا' وہ ان کسانوں اور دریا سے اٹھتی ہوئی نمی کی بو سے دور بھاگ کھڑے ہونے اور جسمانی گندگی کے اس احساس سے دامن چھڑانے کے لیے بری طرح تڑپ رہی تھی جو آج ایک تو کل دوسرے گاؤں میں' کسانوں کے کچے گھروں میں قیام کے دوران مسلسل اس پر مسلط رہتا تھا۔ ریابوفسکی نے مصوروں سے بیس ستمبر تک ٹھہرے رہنے کا پکا وعدہ نہ کر لیا ہوتا تو وہ دونوں آج ہی یہاں سے چل کھڑے ہوتے۔ اور کتنا اچھا ہوتا یہ!

''اوہ خدا!'' ریابوفسکی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آخر آفتاب کب نمودار ہوگا؟ ذرا بھی دھوپ نہیں' ایسے میں دھوپ میں نہائے ہوئے منظر کی عکاسی تو نہیں کر سکتا۔''

"ایک ادھوری تصویر ابر آلود آسمان کی بھی تو ہے" اولگا ایوانوونا نے اوٹ کے پیچھے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "یاد نہیں کیا؟ ارے وہی جس کے پیش منظر میں دائیں جانب جنگل ہے اور بائیں جانب گائیں اور راج ہنس۔ اسے اب مکمل کر سکتے ہو۔"

"ہونہہ!" مصور نے برا مان کے منہ بنایا۔ "مکمل کرلوں! کیا واقعی آپ مجھے ایسا گدھا تصور کرتی ہیں جسے بتایا جائے کہ کیا کرنا چاہیے؟"

"میرے متعلق تمہارا رویہ کتنا بدل گیا!" اولگا ایوانوونا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اور بہت اچھا بھی ہوا!"

اولگا ایوانوونا کا چہرہ بھڑک اٹھا۔ وہ جا کے آتش دان کے سامنے کھڑی ہوگئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔

"اور اب آنسو! جیسے انہی کی تو کسر رہ گئی تھی! بند بھی کیجئے یہ سلسلہ! میرے رونے کے لئے تو ہزار اسباب ہیں پھر بھی میں نہیں روتا۔"

"ہزار اسباب!" اولگا ایوانوونا نے سسکی بھری۔ "خاص سبب صرف یہ ہے کہ مجھ سے آپ کا جی بھر گیا۔ جی ہاں! جی بھر گیا!" اور وہ رونے لگی۔ "سچ پوچھئے تو ہماری محبت سے آپ کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپ ڈرتے ہیں کہ کہیں مصوروں کو بھنک نہ لگ جائے حالانکہ اس معاملے کو چھپایا نہیں جا سکتا اور ان لوگوں کو تو جانے کب ہی سے اس کا علم ہے۔"

"سنئے اولگا! آپ سے میری صرف ایک گزارش ہے" مصور نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر منت سماجت کے لہجے میں کہا۔ "صرف ایک گزارش...... مجھے تنہا چھوڑ دیجئے! اس کے سوا میں آپ سے اور کچھ بھی نہیں چاہتا!"

"لیکن قسم کھائیے کہ آپ اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں!"

"کیسی شدید اذیت ہے یہ!" مصور نے بھنچے ہوئے دانتوں سے پھنکار ماری اور اچھل کے کھڑا ہوگیا۔ "اس کا انجام یہ ہوگا کہ میں والگا میں ڈوب مروں گا یا پاگل ہو جاؤں گا! مجھے تنہا چھوڑ دیجئے!"

''تو مجھے مار ڈالئے' مار ڈالئے!'' اولگا ایوانوونا چیخ اٹھی۔ ''مار ڈالئے نا!''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دوبارہ اوٹ کے پیچھے چلی گئی۔ بارش پیال کے چھپر پر سرسرا رہی تھی۔ ریابوفسکی کچھ دیر تک سر کو دونوں ہاتھوں سے بھینچے کمرے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا رہا' پھر چہرے کے کچھ ایسے تاثر کے ساتھ جیسے بحث میں کسی کو قائل کر دیا ہو' ٹوپی پہن کر بندوق شانے سے لٹکائی اور باہر نکل گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد اولگا ایوانوونا دیر تک اپنے پلنگ پر لیٹی آنسو بہاتی رہی۔ پہلے اس نے سوچا کیسی شاندار بات ہوگی اگر وہ زہر کھالے اور ریابوفسکی اپنی واپسی پر اسے مردہ پائے لیکن جلد ہی اس کے خیالات اپنے ڈرائنگ روم اور شوہر کے مطالعے کے کمرے کی طرف منتقل ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ دیموف کے پہلو میں چپ چاپ بیٹھی سکون اور صفائی کے پر جوش احساس سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور پھر تھیٹر میں بیٹھی مازینی کا گانا سن رہی ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی مہذب دنیا سے' شہر کے شوروغل سے' مشہور و ممتاز لوگوں سے قربت کی شدید آرزو نے اس کے دل کو ماہی بے آب کر دیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی عورت گھر میں آئی اور دوپہر کا کھانا پکانے کے لئے اطمینان کے ساتھ آتش دان کو دھکانے لگی۔ سلگتی ہوئی لکڑیوں کی بو چاروں طرف پھیلی اور دھوئیں سے فضا نیلگوں ہو گئی۔ مصور جن کے لانگ بوٹ کیچڑ سے لت پت تھے اور چہرے بارش سے بھیگے ہوئے' اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی تصاویر پر نظریں دوڑائیں اور اس خیال سے خود کو تسلی دینے لگے کہ والگا خراب موسم میں بھی ایک مخصوص حسن رکھتا ہے۔ دیوار پر آویزاں سستی گھڑی کا پنڈولم ٹک ٹک' ٹک ٹک کئے جا رہا تھا...... سردی سے ٹھٹھری ہوئی مکھیاں مقدس تصویروں کے پاس والے گوشے میں اکٹھا ہو کر دھیرے دھیرے بھنبھنا رہی تھیں اور بنچوں کے نیچے تل چٹے ابھری ہوئی قطاروں میں رینگتے پھر رہے تھے۔

ریابوفسکی غروب آفتاب کے وقت واپس لوٹا۔ اس نے ٹوپی میز پر اچھال دی' کیچڑ میں سنے ہوئے لانگ بوٹ اتارے بغیر تھکن سے چور چور جسم کو بنچ پر ڈھیر کر دیا

اور آنکھیں بند کر لیں۔

"میں تھک گیا....." اس نے کہا اور پپوٹوں کو اٹھانے کی کوشش میں اس کی بھنویں پھڑک اٹھیں۔

اولگا ایوانوونا نے اس کی نظر عنایت حاصل کرنے اور یہ دکھانے کی فکر میں کہ وہ ناراض نہیں ہے اس کے پاس جا کے خاموشی سے اس کا بوسہ لیا اور اس کے بھورے بھورے بالوں میں کنگھی پھیری۔ بالوں میں کنگھی کرنے کی یہ خواہش اس کے دل میں بالکل اچانک ہی پیدا ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ریابوفسکی نے یوں چونک کر جیسے کسی چپچپی چیز نے اسے چھولیا ہو آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہے؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے بڑی عنایت ہو گی!"

وہ اولگا ایوانوونا کو الگ دھکیل کے اس سے کچھ دور ہٹ گیا اور اولگا ایوانوونا کو اس کے چہرے پر نفرت اور جھلاہٹ کی جھلک نظر آئی۔ ٹھیک اسی وقت عورت کرم کلے کے سوپ کی پلیٹ کو احتیاط کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ریابوفسکی کے پاس آئی اور اولگا ایوانوونا نے دیکھا کہ عورت کے دونوں موٹے موٹے انگوٹھے سوپ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تب اسے وہ گندی عورت جس کا سایا پیٹ کے اوپر کسا ہوا تھا کرم کلے کا وہ سوپ جس پر ریابوفسکی ندیدے پن سے ٹوٹ پڑا تھا وہ کچا گھر اور وہ زندگی بڑی گھناؤنی اور ڈراؤنی معلوم ہوئی جو اپنی سادگی اور فنکارانہ بے نظمی کی بنا پر پہلے بڑی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ اسے اچانک اپنی توہین کئے جانے کا احساس ہوا اور سردمہری سے بولی:

"ہمیں کچھ دنوں کے لئے جدا ہونا پڑے گا ورنہ یہ کمبخت اکتاہٹ تو تو میں میں کی نوبت لے آئے گی۔ میں اس سب سے بیزار ہو چکی ہوں۔ مجھے یہاں سے آج ہی چل دینا چاہئے۔"

"کیسے؟ ہوا کے دوش پر؟"

''واقعی؟ ارے ہاں...... بہت خوب' تو پھر چلی جایئے......'' ریابوفسکی نے نیپکن نہ ہونے کی بناء پر تولیے سے ہونٹ پونچھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کے لئے یہ جگہ بے رونق ہے اور میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ آپ کو روکنے کی کوشش کروں۔ چلی جایئے' بیس ستمبر کے بعد پھر ملاقات ہوگی۔''

اولگا ایوانوونا نے سامان باندھنا شروع کیا۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا اور اطمینان کی وجہ سے رخسار تمتمانے لگے تھے۔ '' کیا واقعی ایسا ہی ہوگا'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا' '' کہ میں جلد ہی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوں گی' تصویریں بناؤں گی' خواب گاہ میں سوؤں اور میز پوش والی میز پر کھانا کھاؤں گی؟'' اسے لگا جیسے شانوں کو کچلتا ہوا بھاری بوجھ کافور ہوگیا اور اب اسے مصور پر ذرا بھی غصہ نہیں آرہا تھا۔

'' ارے ریابوشکا! میں رنگ اور برش تمہارے لیے چھوڑے جا رہی ہوں'' اس نے پکار کے کہا۔ '' کوئی چیز تمہارے استعمال سے بچ رہے تو ساتھ لیتے آنا...... اور ہاں! کان کھول کے سن لو' میری عدم موجودگی میں کاہلی اور قنوطیت کے دوروں میں نہ مبتلا ہونا بلکہ کام کرنا! تم بڑے بھولے بھالے ہو' ریابوشکا!''

نو بجے ریابوفسکی نے اس کا الوداعی بوسہ لیا تاکہ جیسا کہ اولگا ایوانوونا کو یقین تھا' عرشے پر مصوروں کی موجودگی میں بوسہ نہ لینا پڑے اور رخصت کرنے کے لئے اسٹیمروں پر چڑھنے اترنے کے چبوترے تک گیا۔ اسٹیمر ذرا دیر بعد ہی نمودار ہوا اور اسے لے کے روانہ ہوگیا۔

ڈھائی دنوں کے بعد وہ اپنے گھر میں تھی۔ ہیٹ اور برساتی اتارے بغیر ہی اضطرابی کیفیت سے تقریباً ہانپتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور وہاں سے کھانے کے کمرے میں۔ دیموف کوٹ اتارے' واسکٹ کے بٹن کھولے میز کے پاس بیٹھا کانٹے کے دندانوں پر رگڑ رگڑ کر چاقو کو تیز کر رہا تھا اور اس کے سامنے پلیٹ میں بھنا ہوا ایک بھٹ تیتر رکھا تھا۔ اولگا ایوانوونا اس یقین کے ساتھ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تھی کہ وہ شوہر کو اس سارے قصے کی ہوا بھی نہ لگنے دے گی اور یہ کہ ایسا

کرنے کی صلاحیت اور قوت بھی رکھتی ہے لیکن جب اسنے دیکھا کہ دیموف کا چہرہ مسکراہٹ سے کھل اٹھا اور اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں تو اس نے سوچا کہ ایسے آدمی کو فریب دینا اس کے لئے اتنی ہی ذلیل' قابل نفرت اور ناممکن بات ہو گی جتنی کہ بہتان تراشی' چوری یا کسی کو قتل کرنا۔ اور اس نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ ہوا ہے اسے من وعن بیان کر دے گی۔ چنانچہ دیموف اسے گلے لگا کر بوسہ لے چکا تو وہ اس کے سامنے گھٹنے کے بل بیٹھ گئی اور چہرے کو ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ کیا ہوا' اولگا؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔" میری یاد بہت ستا رہی تھی کیا؟"

اس نے احساسِ ندامت سے سرخ پڑ جانے والے چہرے کو اٹھا کے دیموف کو خطا کار' ملتجی نگاہوں سے دیکھا مگر خوف وحیا نے حقیقت کو ہونٹوں تک آنے نہ دیا۔

"کوئی بات نہیں......" اس نے کہا۔ "میں بس یوں ہی......"

"آؤ بیٹھیں نا!" دیموف نے بیوی کو اٹھاتے اور میز کے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔" ہاں! اب ٹھیک ہے......لو تیتر کھاؤ۔ بھوکی ہو گی' میری جان۔"

اس نے مانوس ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تھوڑا سا گوشت کھایا جبکہ دیموف خوشی سے ہنستا اور اس پر محبت بھری نگاہیں نثار کرتا رہا۔

سردیاں کوئی آدھی بیت چکی تھیں تب کہیں جا کر دیموف کی نگاہوں میں بیوی کے رنگ ڈھنگ کھٹکنے لگے اب وہ بیوی سے آنکھیں چار ہی نہیں کر پاتا تھا گویا ضمیر خود اسی کا داغدار ہو۔ بیوی سے ملاقات کے وقت اب وہ پر مسرت انداز سے مسکراتا بھی نہیں تھا اور اس خیال سے کہ اس کے ساتھ حتی الامکان کم سے کم وقت تنہائی میں گزارنا پڑے اپنے دوست کوروسیلیف کو ڈنر کے لئے گھر لے آتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والا یہ ناٹا آدمی جس کے چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں' اولگا ایوانوونا کے مخاطب ہوتے ہی انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں کوٹ کے بٹنوں کو بند کرنے اور کھولنے اور پھر اپنی مونچھوں

کے بائیں حصے کو دائیں ہاتھ سے نوچنے لگتا تھا۔ ڈنر کے دوران دونوں ڈاکٹر خیال ظاہر کرتے کہ دیافرغمہ بہت اونچا ہو جاتا ہے تو بعض اوقات اختلاج قلب کی شکایت ہو جاتی ہے یا یہ کہ ادھر کچھ دنوں سے عصبی امراض میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے یا یہ کہ دیموف کو ایک ایسے مریض کی لاش کا جس کی موت کا سبب مہلک کم خونی بتائی گئی تھی' گزشتہ شام کو پوسٹ مارٹم کے دوران پتہ چلا کہ وہ تو دراصل معدے کے سرطان کا مریض تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں یہ طبی تبادلہ خیال محض اس لئے جاری رکھے ہوئے ہیں کہ اولگا ایوانوونا کو بات نہ کرنے یعنی جھوٹ نہ بولنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ ڈنر کے بعد کوروسیلیف پیانو کے سامنے بیٹھ جاتا اور دیموف ٹھنڈی سانس بھر کے کہتا:

''بھئی کچھ سناؤ نا! آخر انتظار کا ہے کا ہے؟ ذرا ہمیں کوئی اچھا سا پر درد گیت سناؤ نا!''

کوروسیلیف شانوں کو ابھار کے انگلیاں آگے پھیلاتا' پیانوں سے سر بلند ہوتے اور وہ اونچی مردانی آواز میں گانے لگتا: ''دکھاؤ' دکھاؤ وطن میں کوئی ایسی جگہ جہاں روسی کسان درد سے کراہ نہ رہا ہو!'' اور دیموف ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھر کے اپنے مکے پر سر ٹکاتا اور خیالوں میں غرق ہو جاتا تھا۔

اولگا ایوانوونا نے تو اب ساری احتیاط کو جیسے بالائے طاق ہی رکھ دیا تھا۔ وہ ہر صبح کو انتہائی افسردہ دلی کے ساتھ بیدار ہوتی اور سوچتی کہ اب وہ ریابوفسکی سے ذرا بھی محبت نہیں کرتی اور خدا کا شکر ہے کہ ان دونوں کے تعلقات قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ لیکن ایک پیالی کافی پینے کے بعد وہ خود کو یاد دلاتی کی ریابوفسکی نے اس کے شوہر کو چھین لیا اور اب اس کی زندگی میں نہ شوہر رہا نہ ریابوفسکی۔ تب اسے خیال آتا کہ اس کے احباب کہہ رہے تھے کی ریابوفسکی کسی نمائش کے لیے کوئی شاندار تصویر مکمل کر رہا ہے جو قدرتی مناظر کی اور معاشرتی مسائل کی مصوری کے امتزاج کا نمونہ اور فنی اعتبار سے پولینوف کے طرز کی ہے اور جو بھی اس کے اسٹوڈیو جاتا ہے' اس تصویر نے مسحور سا ہو

جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی کی ریابوفسکی نے یہ تصویر تو خود میرے زیر اثر تخلیق کی ہے' مجھ سے متاثر ہونے کی بدولت ہی اس کا فن بام عروج پر پہنچا ہے۔ اس کے فن پر میری شخصیت کی چھاپ اتنی سودمند اور گہری ہے کہ اگر آج میں اس سے قطع تعلق کر لوں تو کل وہ کہیں کا نہ رہے۔ وہ یہ یاد کرتی کہ گزشتہ بار ریابوفسکی جب اس کے ہاں آیا تھا تو نقرئی دھاگوں والا بھورا کوٹ پہنے اور نئی ٹائی باندھے ہوئے تھا اور اس نے بڑی دلربائی کے ساتھ پوچھا تھا: ''میں جچ رہا ہوں نا؟'' لمبے لمبے گھنگھریالے بال' نیلی نیلی آنکھیں اور پھر وہ شاندار کوٹ' واقعی وہ بہت جچ رہا تھا (یا کم از کم لگا ایسا ہی تھا) اور اس کی بات بات سے محبت ٹپکتی تھی۔

یہ سب اور کچھ اور بھی یاد کرنے اور خود اپنے نتائج اخذ کرنے کے بعد اولگا ایوانوونا بن سنور کے اپنے جذبات میں طوفان اٹھائے ہوئے ریابوفسکی کے اسٹوڈیو چلی جاتی تھی۔ اسے وہ عموماً بہت ہی ہشاش بشاش اور اپنی تصویر کے عشق میں مبتلا پاتی تھی جو واقعی بہت اچھی تھی۔ جب اس کی طبیعت دل لگی بازی کی طرف مائل ہوتی تھی تو وہ احمقانہ حرکتیں کرتا اور سنجیدہ سوالوں کو ہنس کے ٹال دیا کرتا تھا۔ اولگا ایوانوونا اس تصویر سے جلتی اور نفرت کرتی تھی لیکن ہر بار اس کے سامنے مہذب خاموشی کے ساتھ دو چار منٹ کھڑی رہتی اور پھر جس طرح لوگ کسی درگاہ میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں ویسے ہی سانس بھر کے کہتی:

''ہاں! ایسی تصویر تم نے اور کبھی بھی نہیں بنائی تھی۔ مجھ پر تو یہ لرزہ سا طاری کر دیتی ہے۔''

پھر وہ ریابوفسکی سے منت سماجت کرنے لگتی تھی: مجھ سے محبت کرو نا' مجھے ٹھکراؤ نہیں' مجھ نصیبوں جلی دکھیا پر ترس کھاؤ نا۔ وہ رو رو کے اس کے ہاتھوں کو چومتی' کہتی کہ تمہارے سر سے میرے اثر کا سایہ اٹھ جائے گا تو تم راستے سے بھٹک کے کھو جاؤ گے اور اس طرح اس کے منہ سے یہ اگلوانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ محبت کرتا رہے گا۔ پھر وہ ریابوفسکی کو بری طرح پریشان اور خود کو بری طرح ذلیل کر کے اپنی درزن کے ہاں یا

تھیٹر کا ٹکٹ حاصل کرنے کے چکر میں اپنی کسی ایکٹرس سہیلی کے ہاں چلی جاتی تھی۔
ریابوفسکی کبھی اپنے اسٹوڈیو میں نہیں ہوتا تھا تو وہ اس کے لئے پرچہ چھوڑ آتی تھی جس میں دھمکی دیتی تھی کہ آج ہی مجھ سے نہ ملنے آئے تو زہر کھالوں گی۔ ریابوفسکی ھول کھا کے اس کے ہاں پہنچتا اور ڈنر کے لئے ٹھہر جاتا۔ شوہر کی موجودگی کا پاس لحاظ کئے بغیر وہ اولگا ایوانوونا پر نہایت ہی توہین آمیز فقرے چست کرتا اور وہ ترکی بہ ترکی جوابات دیتی۔ ان دونوں کو لگتا کہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہیں' ظالم اور دشمن ہیں اور اس احساس سے وہ آپے سے باہر ہو جاتے' اس جھلاہٹ میں انہیں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ ان کا طرز عمل کتنا غیر مہذب ہو گیا ہے اور یہ کہ چھوٹے چھوٹے بالوں والے کوروسیلیف تک سب کچھ واضح ہوا جا رہا ہے۔ ڈنر کے بعد ریابوفسکی ان لوگوں سے جلدی جلدی رخصت ہوتا۔

''اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اولگا ایوانوونا ڈرائنگ روم میں اس کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھتی۔

وہ تیوری پر بل ڈالتے اور آنکھوں کو ذرا بھینچتے ہوئے کسی ایسی خاتون کا نام لیتا جس سے دونوں واقف ہوتے اور صاف ظاہر ہوتا کہ اولگا ایوانوونا کے رشک کا مذاق اڑا رہا ہے اور اسے دق کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی خواب گاہ میں جا کے لیٹ جاتی اور رشک' غصے' توہین اور شرم کے مارے تکیے کو دانتوں سے کاٹنے اور زور زور سے رونے لگتی تھی۔ تب دیموف ڈرائنگ روم میں کوروسیلیف کو چھوڑ کر شرمایا گھبرایا ہوا خواب گاہ میں آتا اور دھیرے سے کہتا:

''روؤ نہیں' اولگا...... اس سے حاصل ہی کیا ہو گا؟ تمہیں اس معاملے میں خاموش ہی رہنا چاہئے...... خیال رکھو کہ بات پھیلنے نہ پائے...... جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہونے سے روکا تو جا نہیں سکتا۔''

وہ رشک کے جذبے پر جس کی شدت سے کنپٹیاں پھڑکنے لگتی تھیں' قابو پانے میں ناکام رہتی' خود سے کہتی کہ ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی کہ معاملے کو سلجھایا ہی نہ جا سکے'

آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہروں کو دھوتی، پاؤڈر لگاتی اور جلدی جلدی اس خاتون کے یہاں پہنچتی جس کا ریابوفسکی نے نام لیا تھا۔ وہاں وہ نہ ملتا تو بگھی میں دوسری خاتون کے ہاں جاتی پھر کسی تیسری کے ہاں...... پہلے اسے دوسروں کے گھروں کا یوں چکر لگانے میں خفت محسوس ہوتی تھی لیکن جلد ہی اس کی عادی ہوگئی اور کبھی کبھی تو ایک ہی شام کو ریابوفسکی کی تلاش میں جان پہچان والی ساری کی ساری عورتوں کے ہاں ہو آتی......اور وہ سمجھ جاتیں کہ قصہ کیا ہے۔

ایک بار اس نے ریابوفسکی سے اپنے شوہر کے متعلق کہا:

''اس شخص کی عالی ظرفی میرے لئے وبال جان ہے۔''

یہ جملہ اسے اتنا پسند آیا کہ ریابوفسکی سے اس کے معاشقے کے رازدار مصوروں سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی، وہ اپنے شوہر کا ذکر چھیڑ کے بڑے زوردار انداز میں کہتی تھی:

''اس شخص کی عالی ظرفی میرے لئے وبال جان ہے۔''

ان کی زندگی گزشتہ سال ہی کے ڈھرے پر چلتی رہی۔ ہر بدھ کی شام کو اسی طرح پارٹیاں ہوتی تھیں۔ اسی طرح اداکار خوش خوانی کرتا، مصور خاکے بناتے، وائلن چیلو نواز اپنا ساز چھیڑتا، مغنی گاتا اور اسی طرح ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کھانے کے کمرے میں جانے کا دروازہ کھلتا اور دیموف مسکراتا ہوا کہتا تھا:

''آپ لوگ کھانے پر تشریف لائیے۔''

اور اولگا ایوانوونا پہلے ہی کی طرح اب بھی بڑے آدمیوں کی متلاشی رہتی، انہیں پا جاتی، ان سے مطمئن نہ ہوتی اور دوسرے بڑے آدمیوں کی تلاش میں مصروف ہوجاتی تھی۔ پہلے ہی کی طرح وہ اب بھی ہر روز رات گئے گھر لوٹتی تھی اور گزشتہ سال ہی کی طرح دیموف اب بھی اس کی واپسی کے وقت محو خواب نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا کام کرتا ملتا تھا۔ وہ تین بجے سونے لیٹتا اور صبح آٹھ بجے بیدار ہو جاتا تھا۔

ایک شام کو وہ تھیٹر جانے سے قبل آئینے کے سامنے اپنے بناؤ سنگار کا آخری جائزہ لے رہی تھی تو فراک کوٹ اور سفید ٹائی میں ملبوس دیموف خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے نرمی سے مسکراتے ہوئے بیوی کی آنکھوں سے اگلے وقتوں کی طرح آنکھیں چار کیں۔ اس کے چہرے پر مسرت رقصاں تھی۔

"میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے آ رہا ہوں" اس نے بیٹھ کر پتلون کو گھٹنوں پر برابر کرتے ہوئے کہا۔

"کامیاب رہا؟"

"بس نہ پوچھو!" اس نے ہنستے ہوئے بیوی کے چہرے کے عکس کو آئینے میں دیکھنے کے لئے گردن آگے نکالی کیونکہ وہ اب بھی اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے کھڑی اپنے بالوں کے سنگار کو آخری روپ دے رہی تھی۔ "بس نہ پوچھو!" اس نے ایک بار پھر کہا۔ "اور جانتی ہو، قوی امکان ہے کہ مجھے مرضیات کا ڈوزنٹ مقرر کر دیا جائے۔ لگتا تو بالکل ایسا ہی ہے۔"

دیموف کا پرمسرت، دمکتا ہوا چہرہ کہہ رہا تھا کہ اولگا ایوانوونا اگر اس کی اس خوشی اور شاندار کامیابی پر خاطر خواہ ردعمل ظاہر کرے تو وہ اس کی حال ہی کی نہیں بلکہ مستقبل کی کوتاہیوں کو بھی معاف کرنے کو، سب کچھ بھول جانے کو تیار ہے لیکن اس کی بیوی نہ مرضیات کو سمجھ سکی نہ ڈوزنٹ کو اور ویسے بھی اسے ڈر تھا کہ تھیٹر جانے میں تاخیر نہ ہو جائے اس لئے وہ خاموش ہی رہی۔

دیموف چند لمحوں تک بیٹھا رہا اور پھر معذرتی انداز میں مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

کتنا پریشان کن دن تھا یہ!

دیموف کے سر میں شدید درد تھا۔ اس نے یہ ناشتہ کیا نہ اسپتال گیا، دن بھر اپنے مطالعے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا رہا......اولگا ایوانوونا اپنے معمول کے مطابق

دوپہر کے فوراً ہی بعد ریابوفسکی کے اسٹوڈیو گئی جسے اس کو Nature Morte کے سلسلے میں اپنا بنایا ہوا خاکہ دکھانا اور پوچھنا تھا کہ وہ گذشتہ روز اس کے ہاں کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خاکہ بس یوں ہی سا ہے جسے اس نے مصور کے یہاں جانے کے محض بہانے کے طور پر بنایا تھا۔

وہ گھنٹی بجائے بغیر ہی اندر داخل ہو گئی اور اگلے حصے میں جب جوتوں کے اوپر پہننے کے ربڑ کے جوتے اتار رہی تھی تو اسے اسٹوڈیو میں قدموں کی دبی دبی آہٹیں اور کسی عورت کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اندر جھانکا تو اسے ایک بھورا سایا اپنی ہلکی سی جھلک دکھا کر دوسرے ہی لمحے ایک بڑے سے کینوس کے پیچھے غائب ہو گیا جس پر پڑی سیاہ سوتی چادر ایزل کو ڈھکتی ہوئی فرش تک لٹک رہی تھی۔ یقیناً کوئی عورت وہاں جا کے چھپ گئی تھی۔ یہی تو وہ جگہ تھی جس نے جانے کتنی ہی بار خود اولگا ایوانوونا کو اوروں کی نگاہوں سے چھپا لیا تھا! ریابوفسکی نے جس کی بوکھلاہٹ اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی، اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف یوں پھیلا دیئے جیسے اسے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ہو اور بہ دقت مسکراتے ہوئے کہا:

"آ......اخاہ! آپ کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی! کہئے کیا خبریں ہیں؟"

اولگا ایوانوونا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ اس دوسری عورت کی، اس اپنی "سوت"، اور جھوٹی عورت کی موجودگی میں جو اس وقت کینوس کے پیچھے کھڑی ہوئی یقیناً چپکے چپکے ہنس رہی تھی، باتیں کرنے کو راضی نہیں ہو سکتی تھی چاہے اسے دنیا کی دولت ہی کیوں نہ دے دی جاتی۔

"میں آپ کو محض اپنا یہ خاکہ دکھانے کے لئے آئی ہوں......" اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اونچی شرمیلی آواز میں کہا۔ "یہ ایک نیچر مورٹ ہے۔"

"آ......آخاہ......خاکہ؟"

مصور نے خاکے کو ہاتھ میں لیا، اس پر نظریں جما دیں اور جیسے بالکل غیر شعوری طور پر ٹہلتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اولگا ایوانوونا بڑی فرماں برداری کے ساتھ اس کے پیچھے ہولی۔

''نیچر مورٹ' بے مثال......'' وہ بڑبڑایا اور قافیے تلاش کرتے ہوئے میکانکی انداز میں اضافہ کیا: ''محال' خیال' سوال' وبال......''

اسٹوڈیو سے تیز تیز قدموں کی آہٹیں اور نسوانی سایوں کی جیسی سرسراہٹیں سنائی دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری عورت چلی گئی۔ اولگا ایوانوونا کا جی چاہا کہ وہ چیخ اٹھے' کوئی بھاری چیز اٹھا کے ریابوفسکی کے سر پر وار کرے اور بھاگ کھڑی ہو لیکن آنسوؤں نے اسے نابینا اور شرم نے بالکل نڈھال کر دیا اور اسے ایسا لگا جیسے وہ مصور اولگا ایوانوونا نہیں بلکہ کوئی حقیر بونی ہو۔

''میں تھک گیا ہوں......'' مصور نے خاکے کو دیکھتے اور اپنی تھکن کو سر کے جھٹکے سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مضمحل سے لہجے میں کہا۔ ''بے شک یہ اچھا خاصا ہے لیکن ایک یہ خاکہ آج ہے' ایک گزشتہ سال تھا اور مہینے بھر بعد پھر تیار ہو جائے گا......ان سے آپ کو بیزاری نہیں محسوس ہوتی؟ آپ کی جگہ میں ہوتا تو مصوری کو لات مار کے موسیقی یا اور کسی چیز کو سنجیدگی سے اپنا لیتا۔ دراصل آپ مصور نہیں ہیں' آپ تو موسیقار ہیں۔ خیر' کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ میں کتنا تھک چکا ہوں! میں چائے لانے کے لئے کہتا ہوں......ٹھیک ہے نا؟''

وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور اولگا ایوانوونا نے سنا کہ وہ اپنے نوکر سے کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ رخصت ہونے' تو تو میں میں کی نوبت آنے اور خاص پور سے خود اپنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے سے بچنے کے لئے کمرے سے دوڑتی ہوئی گھر کے اگلے حصہ میں پہنچی اور قبل اس کے کہ ریابوفسکی واپس لوٹے' جوتوں پر ربڑ کے جوتے چڑھا کر باہر نکل آئی۔

سڑک پر پہنچتے ہی اس نے یہ محسوس کرتے ہوئے زیادہ آزادی کے ساتھ سانس لی کہ وہ ریابوفسکی سے' مصوری سے اور اس ناقابل برداشت تذلیل سے جو اس کو اسٹوڈیو میں جھیلنی پڑی تھی' نجات پا چکی ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ سارا قصہ ختم ہو چکا تھا۔

وہ اپنی درزن کے ہاں گئی پھر برنائی کے ہاں جو گزشتہ روز ہی واپس لوٹا تھا اور برنائی کے ہاں سے سازوں کی ایک دوکان میں۔ اس دوران وہ مسلسل ریابوفسکی کے نام اپنے خط کے بارے میں سوچتی رہی جس میں اس نے مہذب لیکن انتہائی سخت اور بے رحمانی انداز میں کھری کھری سنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دیموف کے ساتھ کریمیا جانے کا خیال بھی اس کے ذہن میں منڈلاتا رہا جہاں وہ ماضی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پانے اور نئی زندگی شروع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

رات کو وہ کافی دیر سے گھر لوٹی لیکن لباس تبدیل کرنے کے لئے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے خط لکھنے کے لیے سیدھے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اس نے سوچا کہ ریابوفسکی نے کہا ہے کہ وہ مصور نہیں ہے تو اب وہ اسے منہ توڑ جواب دیتے ہوئے لکھے گی کہ وہ خود ایک ہی تصویر کو ہر سال بناتا ہے، چند گھسی پٹی باتیں ہیں جن کی ہر روز رٹ لگائے رہتا ہے، وہ جمود کا شکار ہو چکا ہے اور اب اس کی کسی مزید کامیابی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ یہ اضافہ کرنے کا بھی ارادہ کر رہی تھی کہ یہ خود اس کی شخصیت کا شاندار اثر تھا جس نے ریابوفسکی کو ریابوفسکی بنایا اور اس کے شاندار اثر کو طرح طرح کی بازاری عورتوں نے جیسی کہ ایک آج کینوس کے پیچھے چھپ گئی تھی، زائل کر دیا۔

''اولگا!'' دیموف نے اپنے مطالعے کے کمرے سے دروازہ کھولے بغیر پکارا۔ ''اولگا!''

''کیا ہے!''

''میرے قریب نہ آنا، اولگا، بس دروازے کے پاس آ جاؤ۔ یہ ٹھیک ہے...... تیسرا دن ہے کہ مجھے اسپتال میں ڈفھیریا لگ گیا اور...... میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کوروسیلیف کو بلوالو۔''

اولگا ایوانوونا اپنے تمام مرد دوستوں کی طرح شوہر کو بھی اس کے خاندانی نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام اوسیپ تھا جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ یہ نام اسے گوگول کے کردار اوسیپ اور دو ناموں اوسیپ اور آرخیپ سے متعلق ایک احمقانہ ضلع

جگیت کی یاد دلاتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ پکار اٹھی:

''نہیں اوسیپ! یہ سچ نہیں ہو سکتا!''

''تم انہیں بلوا لو! میری حالت ٹھیک نہیں......'' دیموف نے کمرے کے اندر سے کہا اور اولگا ایوانوونا کو اس کے صوفے تک جانے اور اس پر لیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ''انہیں بلوا لو!'' دیموف کی آواز کھوکھلی سی لگی۔

''کیا واقعی یہ ممکن ہے؟'' اولگا ایوانوونا نے جس پر ہول طاری ہو گیا تھا' سوچا۔ ''ارے! یہ تو خطرناک ہے!''

وہ بغیر یہ جانے ہوئے کہ ایسا کیوں کر رہی ہے' موم بتی جلا کے اپنی خواب گاہ میں لے گئی اور سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اتنے میں اس کی نظر آئینے میں اپنے عکس پر پڑی۔ پیلا پیلا سہما سہما سا چہرہ' اونچی پھولی پھولی سی آستینوں اور اگلے حصے پر چنٹ دار کپڑے کی جھالر والی صدری اور آڑی ترچھی دھاریوں والا سایا۔ اس نے خود کو ایسے بھیانک اور خوفناک چہرے والے فرد کے روپ میں دیکھا جس سے گھن آتی ہو۔ اس نے اپنے سینے میں دیموف کے لئے' اس شدید محبت کے لئے جو دیموف اس سے کرتا تھا' دیموف کی جوان زندگی اور حتیٰ کہ اس کے خالی پلنگ تک کے لئے جس پر وہ جانے کب سے نہیں سویا تھا' بے پناہ ہمدردی اور افسوس کے جذبات امنڈتے محسوس کئے۔ اسے عجز و انکسار کی آئینہ دار وہ مسکراہٹ نظر آئی جو ہمیشہ دیموف کے ہونٹوں پر چھائی رہتی تھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اس نے کوروسیلیف کو بلانے کے لئے منت سماجت بھرا پرچہ لکھا۔ اب رات کے دو بج چکے تھے۔

صبح کو سات بجے کے فوراً ہی بعد وہ بے خوابی کے باعث بوجھل بوجھل سے سر' الجھے الجھے بالوں اور چہرے پر احساس خطا کی چھاپ کے ساتھ خاصی بدصورت نظر آتی ہوئی اپنی خواب گاہ سے نکلی تو فلیٹ کے اگلے حصے میں سیاہ داڑھی والا شخص جو یقیناً کوئی ڈاکٹر تھا' اس کے قریب سے گزرا۔ چاروں طرف دواؤں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوروسیلیف مطالعے کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا مونچھوں کے بائیں

کنارے کو دائیں ہاتھ سے نوچ رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا' میں آپ کو ان کے پاس نہ جانے دوں گا" اس نے اولگا ایوانوونا سے رکھائی کے ساتھ کہا۔ "مرض لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ ویسے بھی آپ کا ان کے پاس جانا بے سود ہوگا۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔"

"تو کیا یہ واقعی ڈفھیریا ہی ہے؟" اولگا ایوانوونا نے چپکے سے پوچھا۔

"میرا بس چلے تو ان سبھوں کو قید خانے میں پہنچا دوں جو بلا ضرورت خطرہ مول لیتے ہیں" کوروسیلیف اس کے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آپ کو معلوم بھی ہے کہ انہیں یہ روگ کیسے لگا؟ انہوں نے منگل کو ڈفھیریا میں مبتلا ایک چھوٹے لڑکے کے حلق سے مواد چوس لیا تھا۔ اور بھلا کاہے کے لئے؟ سراسر حماقت' محض بے عقلی!"

"کیا یہ بہت خطرناک ہے؟" اولگا ایوانوونا نے پوچھا۔

"ہاں! یہ لوگ کہتے ہیں کہ حالت بہت خراب ہے۔ اب ہمیں شرک کو بلوانا چاہئے۔"

سرخ بالوں' لمبی سی ناک اور یہودی لہجے کا ایک پستہ قد آدمی اندر آیا' اس کے بعد الجھے ہوئے بالوں والا ایک طویل اور خمیدہ قامت شخص جو کوئی آرچ ڈیکن معلوم ہوتا تھا اور پھر سرخ چہرے اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک نسبتاً جوان آدمی جو عینک لگائے ہوئے تھے۔ یہ تینوں ڈاکٹر تھے جو اپنے رفیق کے پلنگ کے پاس باری باری بیٹھنے کے لئے آتے تھے۔ کوروسیلیف جو اپنی باری ختم ہونے کے بعد گھر نہیں گیا تھا' کمروں میں بھوت کی طرح منڈلا رہا تھا۔ خادمہ ڈاکٹروں کے لئے چائے بناتی تھی اور جلدی جلدی دوا فروش کے ہاں جاتی رہتی تھی' اس لئے کمروں کی صفائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ فضا میں بے کیف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اولگا ایوانوونا اپنی خواب گاہ میں بیٹھ کر سوچنے لگی کہ خدا اسے شوہر سے بے وفائی کرنے کی سزا دے رہا ہے۔ وہ کم سخن' کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لانے والا' ہر بات آسانی سے مان لینے والا' معمے جیسا ناقابل فہم وہ شخص جس کی انفرادیت کی بنیادیں اس

کی خوش طبعی نے کھوکھلی کر دی تھیں، جسے اس کی حد سے بڑھی ہوئی نیکی نے کمزور کر دیا تھا، اس وقت صوفے پر لیٹا ہوا ساری اذیتوں کو خاموشی سے جھیل رہا تھا۔ اگر اس نے شکوہ کیا ہوتا، ہذیان کی حالت میں بڑبڑایا ہی ہوتا تو اس کی حالت پر نظر رکھنے والے یہ ڈاکٹر فوراً ہی تاڑ لیتے کہ قصور صرف ڈھیریا ہی کا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے کوروسیلیف سے پوچھا ہوتا جس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں تھا اور جو اپنے دوست کی بیوی کو بلا سبب ہی ایسی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا جو پکار پکار کے کہہ رہی تھیں کہ سب کچھ بیوی ہی کا کیا دھرا ہے، ڈھیریا کی حیثیت تو محض شریک جرم کی سی ہے۔ وہ والگا کے کنارے کی چاندنی رات کو، محبت کرنے کی یقین دہانیوں کو اور کسانوں کے کچے گھر میں گزاری ہوئی رومانی زندگی کو بھول گئی۔ اب تو اسے صرف یہ یاد تھا کہ اس نے کسی گندی اور چپچپی چیز میں غوطہ لگا دیا تھا اور لاکھ دھونے پر بھی کبھی خود کو پاک صاف نہ کر سکے گی...... اور یہ سب کچھ محض من موجی پن میں، محض حقیر تفریح کے لئے!

''میں بھی کیسی دروغ گو نکلی!'' اس نے اپنی اور ریابوفسکی کی بے سکون محبت کو یاد کرتے ہوئے خود سے کہا۔ ''لعنت ہو اس سب پر!......''

چار بجے وہ کوروسیلیف کے ساتھ ڈنر کے لئے بیٹھی۔ ڈاکٹر نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا، نہ صرف ہلکی سرخ شراب پیتا اور ناک بھوں چڑھاتا رہا۔ وہ بھی کچھ کھا نہ سکی۔ بیٹھی ہوئی خاموشی سے دعا مانگتی اور خدا سے وعدہ کرتی رہی کہ دیموف اگر اچھا ہو گیا تو دوبارہ اس سے محبت کرے گی اور وفادار بیوی ثابت ہو گی۔ بیچ بیچ میں وہ اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی مصیبت کو پل بھر کے لئے فراموش کر کے کوروسیلیف کو دیکھتی اور حیرت میں پڑ جاتی۔ ''ایسا معمولی، ایسا غیر معروف شخص، شکن دار چہرے والا، ایسا کندہ ناتراش یقیناً وبال جان ہوتا ہو گا!'' دوسرے ہی لمحے اسے پھر ایسا لگتا جیسے خدا اس پر ابھی ابھی اپنے قہر کی بجلی گرا دے گا کیونکہ وہ چھوت لگ جانے کے اندیشے سے ایکبار بھی اپنے شوہر کے مطالعے کے کمرے میں نہیں گئی ہے۔ اس پر جو ذہنی کیفیت حاوی تھی وہ پریشانی اور بدبختی کے احساس اور اس یقین کی آئینہ دار تھی کہ وہ تباہ ہو چکی ہے، اس طرح بگڑ چکی

ہے کہ دوبارہ بننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

ڈنر کے کچھ ہی دیر بعد شام کا اندھیرا پھیلنے لگا' اولگا ایوانوونا ڈرائنگ روم میں گئی تو اس نے کوروسیلیف کو صوفے پر سوتے پایا۔ اس کا سر سنہرے دھاگوں سے کڑھے ہوئے ریشمی کشن پر رکھا ہوا تھا اور وہ خراٹے لے رہا تھا۔ ''خر......ر......ر' خر......ر......ر۔''

مریض کے پلنگ کے پاس آتے جاتے ہوئے ڈاکٹروں کو اس ساری بدنظمی کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں خراٹے لیتے ہوا عجیب وغریب آدمی' دیواروں پر آویزاں تصاویر' بے ترتیب فرنیچر' بغیر کنگھی کیے ہوئے بالوں اور ملگجے سے باس میں ادھر ادھر پھرتی ہوئی گھر کی مالکن...... یہ ساری چیزیں اب خفیف سی دلچسپی بھی نہیں بیدار کر پا رہی تھیں۔ ایک ڈاکٹر کسی بات پر ہنس پڑا تو یہ ہنسی عجب سہمی سہمی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص بے چین ہوا تھا۔

اگلی بار اولگا ایوانوونا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو کوروسیلیف بیدار ہو چکا تھا اور صوفے پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

''ڈفھیریا ناک کے سوراخوں میں بس گیا ہے'' اس نے دبی زبان سے کہا۔ ''ان کے دل میں اثر ہو چلا ہے۔ حالت خراب نظر آ رہی ہے' بہت خراب۔''

''آپ شرک کو کیوں نہیں بلوا لیتے؟'' اولگا ایوانوونا نے پوچھا۔

''وہ آئے تو تھے۔ انہوں نے ہی تو دیکھا کہ ڈفھیریا سے ناک بھی متاثر ہو چکی ہے۔ اور ویسے شرک ہیں بھی کیا؟ ان میں سرخاب کے پر تھوڑی لگے ہیں۔ وہ شرک ہیں' میں کوروسیلیف ہوں اور بس۔''

وقت انتہائی اذیت زدہ سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اولگا ایوانوونا سارے کپڑے پہنے پہنے ہی اپنے پلنگ پر جس کا بستر صبح ہی سے درست نہیں کیا گیا تھا' لیٹی ہوئی اونگھ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سارے فلیٹ میں فرش سے چھت تک لوہے کا کوئی بہت بڑا ٹکڑا ٹھنسا ہوا ہے اور اس نے سوچا کہ اگر کسی نہ کسی طرح اس زبردست ٹکڑے کو ہٹا دیا جائے تو سب کے دل شاد ہو جائیں' وہ چونک کے بیدار ہوئی اور اس کی سمجھ میں آ گیا

کہ یہ لوہے کا زبردست ٹکڑا نہیں بلکہ دیموف کی علالت ہے۔

''نیچر مورٹ بے مثال' اس نے دوبارہ اونگھتے ہوئے سوچا' ''خیال' سوال' محال......اور شرک بھی ہیں کیا؟ شرک' کسک......پھڑک......بھڑک۔ اور میرے سارے احباب کہاں ہیں؟ ہماری پریشانیوں کی انہیں خبر بھی ہے؟ اوہ پروردگار! ہمیں محفوظ رکھ' ہم پر رحم کر......شرک......کسک......''

اور ایک بار پھر لوہے کا وہی زبردست ٹکڑا......وقت کسی طرح کاٹے ہی نہیں کٹ رہا تھا حالانکہ نچلی منزل کی دیواری گھڑی ہر گھنٹے کی آمد کا پابندی سے اعلان کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجتی رہتی تھی: دیموف کے پاس ڈاکٹر آتے رہتے تھے......خادمہ ٹرے کو جس پر ایک خالی گلاس رکھا ہوا تھا' اٹھائے ہوئے خواب گاہ میں آئی۔

''میں آپ کا بستر درست کر دوں' مادام؟'' اس نے پوچھا۔

جواب نہ ملا ہوا تو وہ چپ چاپ لوٹ گئی۔ نچلی منزل کی دیواری گھڑی نے وقت کا اعلان کیا' اولگا ایوانوونا نے خواب میں دیکھا کہ والگا کے کنارے بارش ہو رہی ہے اور ایک بار پھر کوئی شخص' کوئی اجنبی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کوروسیلیف کو پہچان لیا اور اٹھ کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''کیا بجا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تین بجنے کو ہیں۔''

''ان کا کیا حال ہے؟ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ وہ نزع کے عالم میں ہیں۔'' اس نے بہ دقت سسکی روکی اور آنسوؤں کو آستین کے کف سے پونچھتا ہوا پلنگ پر اولگا ایوانوونا کے پاس بیٹھ گیا۔ فوری طور پر جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی پھر اچانک مفلوج سی ہو گئی اور دھیرے دھیرے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

''نزع کے عالم میں......'' کوروسیلیف نے بلند آواز سے دہرایا اور دوبارہ سسکی بھری۔ ''نزع کے عالم میں ہیں کیونکہ انہوں نے خود کو قربان کر دیا......سائنس کا کتنا

نقصان ہوا!'' اس نے تلخی سے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب کے مقابلے میں وہ ایک عظیم' ایک قابل ذکر انسان تھے!'' کیسی صلاحیتوں کے مالک تھے! اس نے ہاتھ ملتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اوہ میرے خدا! وہ کتنے شاندار سائنس داں بن سکتے تھے' کیسے بے مثال سائنس داں! اوسیپ دیموف' اوسیپ دیموف' آخر تم نے یہ کیا کیا؟ اوہ میرے خدا!''

کوروسیلیف نے مایوسی سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا اور سر کو جنبش دی۔ ''اور کیسی زبردست اخلاقی قوت کے حامل تھے وہ!'' اس نے اپنی بات کسی شخص پر زیادہ سے زیادہ برہم ہوتے ہوئے جاری رکھی۔ ''نیک' خالص محبت سے معمور روح...... بلور کی طرح شفاف! انہوں نے سائنس کی خدمت کی اور سائنس کے فروغ کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی۔ وہ دن رات جان توڑ محبت کرتے تھے' کوئی ان کا خیال نہیں کرتا تھا اور ان کو' قابل و فاضل جوان اور مستقبل کے پروفیسر کو نجی پریکٹس پر وقت ضائع کرنا پڑتا تھا' راتوں کو جاگ جاگ کے ترجمہ کرنا پڑتا تھا تا کہ ان ...... واہیات چیتھڑوں کی قیمت ادا کر سکیں!''

کوروسیلیف نے اولگا ایوانوونا کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور بستر کی چادر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے غصے سے پھاڑ ڈالی گویا سارا قصور چادر ہی کا ہو۔

''انہوں نے نہ خود اپنا خیال رکھا نہ کسی دوسرے نے۔ لیکن اب ان باتوں میں رکھا ہی کیا ہے!''

''جی ہاں! وہ بڑے شاندار انسان تھے!'' ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی گہری آواز سنائی دی۔

اولگا ایوانوونا نے دیموف کے ساتھ گزاری ہوئی اپنی زندگی کو آغاز سے انجام تک بڑی تفصیل کے ساتھ یاد کیا اور دفعتاً وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ واقعی بہت شاندار' نہایت ہی غیر معمولی اور ان تمام فراد کے مقابلے میں جن سے وہ واقف تھی' بہت ہی عظیم انسان تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کا باپ اپنی زندگی میں دیموف کی کتنی عزت کرتا تھا' خود

دیموف کے ساتھی اس سے کیسی محبت سے پیش آتے اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ان سب لوگوں نے دیموف کی شخصیت میں مستقبل کے مشہور و معروف شخص کی جھلک دیکھ لی تھی۔

دیواریں، لیمپ اور فرش پر بچھا ہوا قالین ساری چیزیں مذاق اڑانے والے انداز میں اسے آنکھ مارنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں: ''تم نے موقع کھو دیا!'' وہ روتی ہوئی بڑی تیزی سے اپنی خواب گاہ سے نکلی، ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور اپنے شوہر کے مطالعے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ صوفے پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا اور اس کا جسم کمر تک کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ چہرہ بری طرح سکڑ اور سوکھ سا گیا تھا اور اس پر ایسی خاکستری مائل پیلاہٹ چھا گئی تھی جو زندوں کے چہروں پر کبھی نظر نہیں آتی۔ صرف پیشانی، سیاہ بھوؤں اور جانی پہچانی مسکراہٹ سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ دیموف ہے۔ اولگا ایوانوونا نے جلدی جلدی اس کے سینے، پیشانی اور ہاتھوں کو چھوا۔ سینہ تو اب بھی گرم تھا لیکن پیشانی اور ہاتھ برف ہو چکے تھے۔ اور اس کی نیم وا آنکھیں اولگا ایوانوونا کو نہیں بلکہ کمبل کو تک رہی تھی۔

''دیموف!'' اس نے زور سے پکارا...... ''دیموف!''

وہ اس سے یہ کہنے کو بے تاب تھی کہ جو کچھ ہوا وہ سب غلط تھا، پانی ابھی سر سے اونچا نہیں ہوا، زندگی میں اب بھی بہار آ سکتی ہے اور یہ کہ دیموف ایک غیر معمولی، ممتاز اور عظیم انسان ہے، وہ عمر بھر اس کی پرستش کرے گی، اس کے سامنے سر جھکائے گی، اس سے ایک طرح کا مقدس خوف محسوس کرے گی۔

''دیموف!'' اولگا ایوانوونا نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے پکارا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ دیموف اب کبھی بھی بیدار نہ ہوگا۔ ''دیموف! دیموف! میں پکار رہی ہوں!''

اور ڈرائنگ روم میں کوروسیلیف خادمہ سے کہہ رہا تھا:

''اس میں مشورہ کرنے والی کون سی بات ہے؟ گرجے میں جا کر پوچھ لیجئے کہ خیرات لینے والی عورتیں کہاں پہ رہتی ہیں۔ وہ آ کے میت کو غسل دیں گی اور سب کچھ ٹھیک کر دیں گی، جو کچھ ضروری ہے سب کر دیں گی۔''

وارڈ نمبر 6

اسپتال کے احاطے میں اسی سے متعلق ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی جس کے چاروں گوکھرو، بچھو اور جنگلی سن کے پودوں کا جنگل کھڑا ہے۔ اس کی چھت زنگ آلود ہے، چمنی ٹکڑے ٹکڑے ہو چلی تھی، برساتی کی گلی سڑی چوبی سیڑھیوں پر گھاس اگی ہوئی ہے اور جہاں تک دیواروں کا تعلق ہے تو انہیں غور سے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان پر کبھی پلستر بھی کیا گیا تھا۔ اس کے سامنے کے رخ پر اسپتال ہے اور عقب میں ایک کھیت جس سے اسے باہر نکلی ہوئی ڈھیروں کیلوں والے بدرنگ جنگلے نے الگ کر رکھا ہے، آسمان کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کیلیں، جنگلے اور خود اس عمارت کی خستگی کہہ رہی ہے کہ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں اور ہمارے ہاں صرف اسپتال اور قید خانے کی عمارتیں ہی اس حالت میں ہوتی ہیں۔

بچھوے کے کانٹوں سے آپ کے رونگٹے نہ کھڑے ہوتے ہوں تو آیئے، چھوٹی عمارت تک جاتی ہوئی اس پگڈنڈی پر میرے ساتھ چلئے، ذرا اندر تو جھانکیں ہم دروازہ کھولتے اور خود کو ایک گزرگاہ میں پاتے ہیں۔ اسپتال کی ردی چیزوں کے پہاڑ دیواروں اور آتش دان سے لگے کھڑے ہیں۔ گدے، پرانے اسپتالی لبادے، پتلونوں کے نیچے پہننے کے تنگ مہری کے پاجامے، دھاری دار نیلگوں قمیصیں، پرانے جوتے...... اس انبار میں جو کچھ بھی ہے بالکل چیتھڑوں جیسا سڑا گلا ہے، بالکل بے مصرف اور اس کی بدبو دم گھونٹنے والی ہے۔

بوڑھا ریٹائرڈ سپاہی نیکیتا جس کی وردی کی پٹیاں پھپھوندی جیسی لگتی ہیں اور جو

یہاں چوکیدار ہے' دانتوں میں پائپ دبائے کوڑے کرکٹ کے اسی انبار کے اوپر لیٹا رہتا ہے۔ اس کا سخت' کثرت بادہ نوشی سے مسخ چہرہ جھبری جھبری بھوؤں کی بناء پر بھیڑوں کی رکھوالی کرنے والے روسی کتے کے چہرے جیسا معلوم ہوتا ہے۔ لال لال ناک' چھوٹا سا قد اور دبلا پتلا جسم' پھر بھی کوئی ایسی بات ہے جو اس کی وضع قطع کو رعب دار بنا دیتی ہے اور اس کے مکے تو خاص طور پر بہت بڑے بڑے ہیں۔ وہ انہی بے لاگ' قابل اعتبار' کارگزار اور کوڑھ مغز لوگوں میں سے ایک ہے جو دنیا کی ہر شے سے زیادہ نظم و ضبط کی قدر کرتے اور یقین رکھتے ہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگے۔ وہ چہروں' سینوں اور پیٹھوں پر اندھا دھند مکے برساتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک نظم و ضبط برقرار رکھنے کی واحد صورت یہی ہے۔

یہاں سے آگے بڑھ کے آپ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور اگر گزرگاہ والی جگہ کو نہ شمار کیجئے تو سمجھئے کہ یہ ساری چھوٹی سی عمارت بس اسی کمرے ہی پر مشتمل ہے۔ دیواریں مٹیالے نیلے رنگ سے لتھڑی ہوئی ہیں' چھت اگلے وقتوں کے کسی جھونپڑے کے شہتیروں کی طرح کالک سے اٹی ہوئی ہے اور چمنی کی عدم موجودگی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سردیوں میں آتش دانوں کا دھواں فضا میں زہر پھیلاتا رہتا ہے۔ کھڑکیاں جن میں اندر سے آہنی سلاخیں لگی ہوئی ہیں' انتہائی بدنما اور فرش بدرنگ اور ٹوٹا پھوٹا ہے۔ سارے ماحول میں ترش کرم کلے' دھواں نکالتے ہوئے لیمپوں' کھٹملوں اور امونیا کی بو بسی ہوئی ہے اور اندر قدم رکھتے ہی اس بدبو کی بناء پر آپ کو ایسا لگتا ہے جیسے کسی چڑیا گھر میں داخل ہو رہے ہوں۔

پلنگوں کے پائے فرش میں جڑے ہوئے ہیں اور ان پر اسپتالی لبادے اور رات کو سوتے وقت استعمال کرنے کی قدیم طرز کی ٹوپیاں پہنے ہوئے لوگ بیٹھے یا لیٹے ہیں۔ یہ سب دماغی مریض ہیں۔

ان کی تعداد پانچ ہے۔ صرف ایک کا تعلق اونچے طبقے سے ہے اور باقی معمولی لوگ ہیں۔ دروازے سے قریب ترین پلنگ پر چمکتی ہوئی سرخ مونچھوں والا ایک دبلا

پتلا طویل قامت آدمی جس کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو چکی ہیں' سر کو اپنی مٹھیوں پر ٹکائے ہوئے بیٹھا اپنے آگے کی طرف ٹکٹکی باندھے تکے جا رہا ہے۔ وہ دن رات سر ہلاتے' ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور تلخی سے مسکراتے ہوئے اپنے غموں کو جھیلتا رہتا ہے۔ عام گفتگو میں تو وہ کبھی کبھار شریک بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کوئی اس سے مخاطب ہوتا ہے تو جواب کبھی بھی نہیں دیتا۔ کھانے پینے کی چیزیں لائی جاتی ہیں تو میکانکی آواز میں انہیں لے لیتا ہے۔ اس کی تکلیف دہ' تقریباً مسلسل آنے والی کھانسی اور رخساروں پر مرض کی تمتماہٹ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دق کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے۔

بعد والا پلنگ ایک پستہ قد' زندہ دل اور انتہائی پھرتیلے بوڑھے کا ہے جس کی داڑھی نکیلی اور سر کے بال اتنے سیاہ اور گھنگریالے ہیں جیسی کسی نیگرو کے ہوں۔ دن کے وقت وہ کمرے میں ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی تک اکڑتا پھرتا ہے یا پھر اپنے پلنگ پر پالتی مار کے بیٹھے بیٹھے باری باری سے گانے والی ننھی چڑیا بل فنچ کے جیسے انتھک انداز میں سیٹیاں بجاتا' دھیرے دھیرے گاتا یا محض منہ دبا دبا کے ہنستا رہتا ہے۔ رات کو بھی وہ اپنی بچگانہ تیزی و طراری اور زندہ دلی کے مظاہرے سے نہیں چوکتا اور اٹھ کر عبادت کرتا یعنی دوہرے مکے سے سینے کو پیٹتا ہے اور ہاتھ پھیلا کے دروازے کو ڈھونڈتا ٹٹولتا رہتا ہے۔ وہ ہے موئے سینکما' یہودی ہیٹ ساز جو گزشتہ بیس برسوں سے' اسی دن سے پاگل ہے جب سے اس کی دوکان جلادی گئی تھی۔

وارڈ نمبر 6 کا وہی ایک ایسا باسی ہے جسے وارڈ سے باہر نکلنے ہی کی نہیں بلکہ اسپتال کے احاطے کو پار کر کے سڑک پر جانے کی بھی اجازت حاصل ہے۔ اسے یہ مخصوص رعایت برسوں سے ملی ہوئی ہے' شاید اس لئے کہ اتنی طویل موت سے اسپتال میں مقیم ہے' ہلڑ ہنگامہ نہیں کرتا' کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا اور اہل شہر کی تفریح کا سامان فراہم کرنے والا ایسا احمق ہے جس کا چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور کتوں کے ہجوم کے درمیان نمودار ہونا روزمرہ کا ایک جزو بن چکا ہے۔ وہ اسپتالی لبادے' سوتے وقت پہننے کی واہیات ٹوپی اور چپلوں میں یا پھر ننگے پیر اور لبادے کے نیچے بالکل برہنہ حالت میں

سڑکوں پر مارا مارا پھرتا اور گھروں کے پھاٹکوں اور دوکانوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کے ایک ایک کوپیک کی بھیک مانگتا ہے۔ کہیں اسے ''کواس'' پینے کو مل جاتا ہے تو کہیں روٹی کا ایک ٹکڑا اور ایک کوپیک اور وہ مال دار اور مطمئن ہو کر واپس آ جاتا ہے۔ پر وہ جو کچھ بھی لاتا ہے اسے نیکیتا چھین لیتا ہے۔ سپاہی یہ کام بڑے غصے اور زور زبردستی کے ساتھ انجام دیتا ہے' موئے سینکما کی جیبیں الٹ الٹ کے تلاشی لیتا اور خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ وہ اب اس یہودی کو کبھی بھولے سے بھی باہر نہ جانے دے گا نیز یہ کہ بدنظمی سے برا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں۔ موئے سینکما میں مروت کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ ساتھی پیاسے ہوتے ہیں تو جا کے پانی لے آتا ہے' وہ سو جاتے ہیں تو انہیں کمبل اوڑھا دیتا ہے اور وعدہ کرتا رہتا ہے کہ شہر سے ان کے لئے ایک ایک کوپیک لے آئے گا اور نئی ٹوپیاں سی دے گا۔ یہ موئے سینکما ہی ہے جو اپنے مفلوج' بائیں جانب والے پڑوسی کو چمچ سے کھلاتا ہے' یہ الگ بات کہ وہ یہ کام ترس اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے نہیں بلکہ محض تقلید کے طور پر' اپنے دائیں جانب والے پڑوسی گروموف کی شخصیت سے انجانے میں اثر قبول کر کے انجام دیتا ہے۔

ایوان دمتیرچ گروموف جو یہی کوئی تینتیس سال کا ہوگا' اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کسی زمانے میں عدالت کے حکم کی تعمیل کرنے والا اور صوبائی حکومت کے ایک دفتر کا سیکرٹری رہ چکا ہے۔ وہ اس خبط میں مبتلا ہے کہ اذیت پہنچانے کے لئے اس کا مسلسل تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ یا تو اپنے پلنگ پر گٹھری بنا لیٹا رہتا ہے یا پیچھے اور آگے کی طرف یوں چلتا ہے جیسے چہل قدمی کر رہا ہو' گھبراہٹ اور بے چینی کا غلبہ رہتا ہے' کسی غیر واضح' انجانے سانحے کی توقع اسے ہمیشہ ہی ہیجان میں مبتلا رکھتی ہے۔ گزرگاہ میں کوئی خفیف سی سرسراہٹ ہو یا احاطے میں کوئی آواز ابھرے' وہ فوراً ہی چونک کے سر اٹھاتا اور ہمہ تن گوش بن جاتا ہے.......... کیا وہ لوگ اسے لے جانے کے لیے آن پہنچے؟ کیا انہیں اسی کی تلاش ہے؟ ایسے موقعوں پر اس کا چہرہ انتہائی اضطراب اور نفرت کا تاثر پیش کرتا ہے۔

میں اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں والے کشادہ' زرد اور اُداس چہرے کو پسند کرتا ہوں جو مسلسل کشمکش اور خوف سے اذیت میں مبتلا اس کی روح کی کسی آئینے کی طرح عکاسی کرتا ہے۔ منہ تو وہ ضرور عجب مریضانہ انداز سے بناتا رہتا ہے لیکن گہری اور حقیقی تکلیف نے چہرے پر جو ہلکی شکنیں ڈال دی ہیں' ان سے زود حسی اور ذہانت ٹپکتی ہے اور آنکھوں سے گرمجوشی اور سوجھ بوجھ کی چمک۔ میں س مہذب' نیک اور نیکیتا کو چھوڑ کر باقی سب کا خیال رکھنے والے شخص کو پسند کرتا ہوں۔ کسی کا کوئی بٹن یا ہاتھ سے چمچ گر جاتا ہے تو فوراً ہی پلنگ سے اتر کے اسے اٹھا دیتا ہے۔ بیدار ہونے پر ہر ایک سے ''صبح بخیر'' اور سونے سے قبل ''شب بخیر'' کہنا تو وہ کبھی بھی نہیں بولتا۔

اس کے جنون کا اظہار منہ بنانے اور مسلسل مضطرب رہنے کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقوں سے ہوتا ہے: کبھی کبھی شاموں کو وہ اپنے اسپتالی لبادے کو جسم پر کس لیتا ہے' سر سے پاؤں تک کانپنے لگتا ہے' دانت بجنے لگتے ہیں اور اسی حالت میں کمرے کے اِس سرے سے اُس سرے تک اور پلنگوں کی درمیانی جگہوں پر تیزی سے چلنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ شدید بخار کے مریض سے مشابہ ہوتا ہے۔ پھر وہ جس طرح اچانک ٹھہر کے ساتھیوں پر نظریں دوڑاتا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ان لوگوں سے کوئی بڑی اہم بات کرنی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے سر کو بے صبری سے جھٹک کر دوبارہ چلنے لگتا ہے جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ کوئی متوجہ نہ ہو گا۔ اور متوجہ بھی ہو گیا تو بات پلے نہ پڑے گی......تھوڑی ہی دیر بعد بات کرنے کی خواہش تمام مصلحتوں پر غالب آ جاتی ہے اور اس کے منہ سے الفاظ کا دھارا پھوٹ نکلتا ہے۔ اس کی یہ دھواں دھار تقریر جو تیز بخار کے مریض کے ہذیان کی طرح بے ربط ہوتی ہے' ہمیشہ تو قابل فہم نہیں ہوتی لیکن لفظوں اور لہجے میں ایک ایسی کیفیت ہوتی ہے جو عجب انداز سے دل کو چھو لیتی ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو آپ اس کے اندر کی دونوں آوازوں کو سن سکتے ہیں' ایک ہوتی ہے فرزانے کی اور دوسری دیوانے کی۔ اس کی اس جنونی بڑ کو کاغذ پر قلم بند کرنا بہت مشکل ہو گا۔ وہ باتیں کرتا ہے انسانی کمینگی کی' اس ظلم کی جو سچائی کا گلا گھونٹ دیتا ہے' اس خوبصورت

زندگی کی جس کا ایک روز دنیا میں ظہور ہو گا اور کھڑکیوں میں لگی ہوئی ان آہنی سلاخوں کی جو اسے ظالموں اور جابروں کی حماقت اور سنگدلی کا مسلسل احساس دلاتی رہتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان گیتوں کا بے ربط اور بے سلیقہ امتزاج وجود میں آتا ہے جو ویسے تو پرانے ہیں مگر ابھی آخر تک گائے نہیں گئے۔

بارہ یا شاید پندرہ برس ہوئے ہوں گے کہ ایک سرکاری افسر گروموف اسی قصبے کی خاص سڑک پر واقع اپنے ذاتی مکان میں عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے: سرگیئی اور ایوان۔ سرگیئی نے یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے ابھی ہی تین سال پورے کیے تھے کہ تیزی سے بڑھنے والی دق میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اس کا مرنا تھا کہ مصیبتوں نے گروموف کا جیسے گھر ہی دیکھ لیا۔ سرگیئی کی تجہیز و تکفین کے ایک ہی ہفتے بعد بوڑھے گروموف پر جعل سازی اور غبن کے الزام میں مقدمہ دائر ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد قید خانے کے اسپتال میں ٹائفس نے اس کی جان لے لی۔ اس کے گھر اور املاک کو نیلام کر دیا گیا اور ایوان دمیترچ اور اس کی ماں کی گزر بسر کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہ گیا۔

باپ کی زندگی میں ایوان دمیترچ پیٹرس برگ میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، گھر سے ہر مہینے ساٹھ ستر روبل آ جاتے تھے اور کسی تنگ دستی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی زندگی کو دوسرے ہی سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے صبح سے رات گئے تک سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی، تھوڑے سے پیسوں کے لیے بچوں کو پڑھاتا، دستاویزات کی نقلیں کرتا، پھر بھی پیٹ کی آگ بجھائے نہ بجھتی کیونکہ تھوڑا بہت جو کچھ ملتا اسے ماں کو بھیج دیا کرتا تھا۔ ایوان دمیترچ اس طرح کی زندگی کے لیے بنا ہی نہ تھا، حوصلے پست ہو گئے، بیمار پڑا اور یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کر گھر لوٹ آیا۔ یہاں بااثر دوستوں کی مدد سے اسے ضلع اسکول میں پڑھانے کی نوکری مل گئی لیکن اس کے لئے نہ دوسرے اساتذہ سے نباہ کرنا ممکن ہو رہا تھا اور نہ ہی بچوں میں کوئی مقبولیت حاصل ہو رہی تھی اس لئے جلد ہی استعفٰی دے دیا۔ پھر اس کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس نے چھ مہینے بیکاری میں یوں کاٹے کہ روٹی اور پانی کے سوا کسی چیز کا ذائقہ چکھنا تک نصیب

نہ ہوا۔ تب اسے عدالت کے حکم کی تعمیل کرانے والے کی حیثیت سے ملازمت ملی اور اس عہدے پر خرابی صحت کی بناء پر برطرف کیے جانے تک مامور رہا۔

وہ کبھی بھی، یہاں تک کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی ہٹا کٹا نہیں رہا تھا۔ ہمیشہ وہی دبلا پتلا جسم، پیلا پیلا چہرہ، ذرا بھی سردی لگی اور زکام نے آ دبوچا، کم کھانا اور گہری نیند نہ سو پانا۔ ہلکی شراب کا بس ایک ہی گلاس اسے بے خود اور آپے سے باہر کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی دوسروں میں کشش محسوس کرتا تھا۔ لیکن اپنے جھکی اور شکی مزاج کی بناء پر کسی سے کبھی گہرے مراسم نہ قائم کر سکا اور ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا دوست کہہ سکتا۔ قصبے کے لوگوں کا ذکر وہ ہمیشہ ہی حقارت کے ساتھ کرتا اور کہا کرتا تھا کہ یہاں کے لوگوں کی جہالت اور ان کے جانوروں جیسے کاہل وجود سے اسے متلی آتی ہے۔ اس کی آواز باریک اور تیز تھی، زور زور سے جوشیلے انداز میں باتیں کرتا تھا اور ہمیشہ ہی بڑے خلوص کے ساتھ آپ اس کے سامنے کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ چھیڑتے وہ گفتگو کو کھینچ تان کے اپنے محبوب موضوع ہی کی طرف لے آتا تھا: ہمارے قصبے کے ماحول میں بڑی گھٹن ہے، زندگی بے کیف ہے، اعلا و ارفع دلچسپیوں سے یکسر خالی معاشرہ اپنے بے جان بے معنی وجود کو جوں توں برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس میں جان بھی پڑتی ہے تو صرف تشدد سے۔ واہیات قسم کی عیاشی اور مکاری سے۔ بے ایمان گلچھرے اڑاتے ہیں، ایمان دار روز کنواں کھودتے، روز پانی پیتے ہیں، یہاں ضرورت ہے اسکولوں کی، ایک ترقی پسند مقامی اخبار کی، ایک تھیٹر، پبلک لیکچروں اور تمام دانش وروں کے اتحاد و تعاون کی، معاشرے کو ان سب باتوں کا احساس دلانا چاہیے، دکھایا جانا چاہیے کہ وہ کتنا نفرت انگیز ہے۔ اپنے ہم عصروں کے متعلق فیصلے صادر کرتے وقت وہ ان کی عکاسی رنگوں کی موٹی موٹی تہیں جما کر کیا کرتا تھا لیکن اس کی رنگ ملانے کی تختی پر صرف سیاہ اور سفید رنگوں ہی کو جگہ ملتی تھی، زیادہ لطیف رنگوں کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ دراصل اس کا خیال تھا کہ انسان یا تو بے ایمان ہوتے ہیں یا ایمان دار اور ان دونوں کے بیچ انسانوں کی کسی اور قسم کا وجود نہیں۔ عورتوں اور محبت کے بارے میں وہ بڑے پرشوق

جوش و خروش سے اظہار کیا کرتا تھا حالانکہ خود کبھی محبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنی ان تمام نکتہ چینیوں اور اضطراری جھلاہٹ کے باوجود قصبے میں پسند کیا جاتا تھا اور پیٹھ پیچھے لوگ اسے دانیا کہا کرتے تھے۔ اس کی نفاست پسندی، لوگوں کے کام آنے کی عادت، اعلیٰ اصول اور اخلاقی دیانت داری، اس کا پرانا کوٹ، مریضوں جیسی صورت اور ان مصیبتوں کا تصور جو اس کے خاندان پر نازل ہوئی تھیں۔ ساری چیزیں ایک دوسرے سے مل جل کر اس کے سلسلے میں گرمجوشی اور دوستی کے جذبات بیدار کرتی تھیں۔ جن میں افسوس کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس سب کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی تھی اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں جو اس کے علم میں نہ ہو اور اسے ایک طرح کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تصور کیا جاتا تھا۔

کتابوں کا تو وہ کیڑا تھا۔ اکثر کلب میں دیر تک بیٹھا اپنی چگی داڑھی کو اضطرابی کیفیت سے کھینچ کھینچ کر رسالوں اور کتابوں کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ ذہن کو سوچنے کا ذرا بھی موقع دیئے بغیر سارے مواد کو ہڑپ کئے جا رہا ہے۔ دراصل مطالعہ اس کی مریضانہ لت بن کر رہ گیا تھا کیونکہ جو کچھ بھی اس کے ہاتھ لگ جاتا تھا اس پر یکساں ندیدے پن کے ساتھ ٹوٹ پڑتا تھا۔ خواہ وہ گذشتہ سال کے اخبارات یا جنتری جیسا ہی غیر دلچسپ مواد کیوں نہ ہو۔ گھر میں ہمیشہ لیٹ کر ہی مطالعہ کیا کرتا تھا۔

خزاں کی ایک صبح کو ایوان دمیترچ اپنے کوٹ کا کالر کھڑا کیے ہوئے کیچڑ دار گلیوں اور عقبی احاطوں سے گزرتا ہوا عدالت کے حکم کی تعمیل کے لئے کسی کے ہاں جا رہا تھا اس کا موڈ ہر صبح کے جیسا یعنی خراب تھا۔ ایک گلی میں اس کا سامنا چار مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں جاتے ہوئے دو قیدیوں سے ہوا جن کے ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایوان دمیترچ ایسے مناظر کا عادی ہو چکا تھا اور یہ ہر بار اس کے دل میں ترس اور گھبراہٹ کے جذبات بیدار کر دیا کرتے تھے لیکن اس وقت وہ بلا سبب ہی بری طرح متاثر ہو گیا۔ جانے کیوں

اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ خود اسے بھی ہتھکڑی پہنا کر انہی قیدیوں کی طرح کیچڑ دار سڑکوں سے قید خانے لے جایا جا سکتا ہے۔ حکم نامہ دے کر وہ گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں ڈاک خانے کے پاس اس کی ملاقات اپنی جان پہچان والے ایک پولیس انسپکٹر سے ہو گئی جو صاحب سلامت کے بعد چند قدموں تک اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ انسپکٹر کی اس حرکت سے جانے کیوں ایوان دمیترچ کا ماتھا ٹھنک گیا۔ گھر پہنچنے کے بعد قیدیوں اور رائفلیں لئے ہوئے سپاہیوں کا تصور تمام دن اس کو پریشان کرتا رہا اور کسی عجیب و غریب ذہنی بے چینی نے نہ کچھ پڑھنے دیا نہ کچھ اور سوچنے۔ شام کو اس نے لیمپ نہ جلایا اور رات بھر اس اندیشے سے نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور رہی کہ اسے بھی گرفتار کر کے، ہتھکڑی پہنا کر قید خانے میں بند کیا جا سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے کبھی کوئی جرم سرزد نہیں ہوا اور وہ ضمانت دے سکتا تھا کہ آئندہ بھی کبھی قتل، آتش زنی یا چوری کا مرتکب نہ ہوگا لیکن اس نے سوچا کیا یہ ممکن نہیں کہ بلا ارادہ، محض اتفاقاً ہی وہ کوئی جرم کر بیٹھے؟ اور پھر کیا مجرمانہ دھوکے یا انصاف تک کی کوتاہی جیسی باتوں کی کوئی کمی ہے؟ کیا یہ کہاوت کہ "دارالمساکین اور زنداں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے" صدیوں کے تجربات کا نچوڑ نہیں ہے؟ اور عدالتی کارروائیوں کی اس وقت جو حالت ہے اس میں انصاف کی کوتاہی سے زیادہ اور کاہے کا امکان ہے؟ ججوں، پولیس کٹر افسروں اور ڈاکٹروں جیسے لوگ جو انسانی درد و غم کو محض سرکاری نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ اور عادتاً بھی اتنے بے حس اور بے رحم ہو جاتے ہیں کہ وہ اگر چاہیں بھی تو ان افراد کے سلسلے میں جن سے انہیں نپٹنا پڑتا ہے، رسمی کے سوا اور کوئی بھی رویہ نہیں اپنا سکتے۔ اس معاملے میں یہ لوگ اس کسان سے ذرا بھی مختلف نہیں ہوتے جو اپنے عقبی احاطے میں بھیڑوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتا ہے اور خون کی طرف بھولے سے بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اس رسمی اور بے رحم رویے کے مستحکم ہو جانے کے بعد جج کو کسی بے گناہ کو اس کے تمام حقوق سے محروم کرنے اور قید بامشقت کی سزا دینے کے لئے بس ایک ہی چیز درکار ہوتی ہے...... وقت! صرف اتنا وقت جس کے دوران وہ

چند رسمی کارروائیاں پوری کی جاسکیں جن کے لئے جج کو تنخواہ ملتی ہے اور بس سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔ انصاف اور تحفظ کی تلاش اور وہ بھی اس چھوٹے سے گندے قصبے میں جو قریب ترین ریلوے اسٹیشن سے دوسو ورسٹ کے فاصلے پر واقع ہے! اور کیا انصاف کے متعلق ان حالات میں سوچنا لغویات نہیں ہے جبکہ ظلم و جبر کے ہر اقدام کو معاشرہ معقول اور مناسب تصور کرتا ہے اور کسی قیدی کی رہائی جیسے رحم دلی کے ہر اقدام پر غیر مطمئن اور انتقامانہ جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے؟

اگلی صبح کو ایوان دمیترچ بستر سے اٹھا تو خوف کے مارے جان نکلی جا رہی تھی' پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا تھا اور اسے یقین تھا کہ کسی بھی لمحے گرفتار کر لیا جائے گا۔ گزشتہ دن کے اذیت دہ خیالات سے کسی طرح نجات ہی نہیں مل رہی تھی' اس لئے اس نے سوچا کہ ان خیالات کی یقیناً کوئی نہ کوئی حقیقی وجہ ہو گی۔ ظاہر تھا کہ یہ اندیشے اس کے دل میں کسی معقول وجہ کے بغیر تو نہیں پیدا ہو سکتے تھے۔ ایک پولیس والا اس کی کھڑکی کے سامنے دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا گزرا۔ اس کا مطلب کیا تھا؟ دو افراد اس کے گھر کے سامنے ٹھہر کر خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ آخر خاموش کیوں تھے؟

اور اس طرح ایوان دمیترچ کے لئے روز و شب کے ذہنی کرب کا آغاز ہوا۔ جو بھی اس کی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرتا یا احاطے میں داخل ہوتا اسے وہ مخبر یا سراغ رساں تصور کرتا۔ ضلع پولیس انسپکٹر کو ہر روز دوپہر کے وقت اپنی دو گھوڑوں والی بگھی میں سڑک سے گزرنے کی عادت تھی۔ وہ اپنی دیہی حویلی سے پولیس کے دفتر آیا کرتا تھا لیکن ایوان دمیترچ کو لگتا کہ گھوڑوں کی رفتار بہت تیز ہے' پولیس افسر کے چہرے پر کوئی خاص کیفیت پائی جاتی ہے اور شاید وہ جلد از جلد دفتر پہنچ کر قصبے میں نہایت ہی خطرناک مجرم کے قیام کی اطلاع دینا چاہتا ہے۔ دروازے کی گھنٹی بجتی یا پھاٹک پر کوئی دستک دیتا تو ایوان دمیترچ چونک پڑتا' مکان مالکن سے کوئی ایسا شخص ملنے آتا جس سے وہ واقف نہیں ہوتا تھا تو وہ بوکھلا اٹھتا اور کسی پولیس والے کے سامنا ہو جاتا تو وہ پرسکون نظر آنے کے لئے مسکرانے اور سیٹیوں میں کوئی دھن بجانے لگتا تھا۔ اپنی گرفتاری کے خوف سے

ساری رات جاگ کے کاٹ دیتا تھا لیکن زور زور سے خراٹے لیتا رہتا تا کہ مکان مالکن سوچے کہ وہ سو رہا ہے کیونکہ اس کے خیال میں بیداری سے یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ جرم کا احساس ستا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا اشارہ ہوتا۔ حقائق اور عقل سلیم اسے یقین دلاتے تھے کہ اس کی یہ دہشت بے بنیاد ہے۔ لیکن شہر میں دہشت گردی اور قاتلوں کے سوا گفتگو کا اور کوئی موضوع ہی نہ رہ گیا۔ ایوان دمیترچ فکر مند ہو گیا کہ کہیں اسی کو قاتل نہ سمجھ لیا جائے' اس لئے وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر کے سڑکوں پر گھومنے لگا اور جب بھی کوئی واقف کار مل جاتا تو اسے یقین دلانے لگتا کہ کمزور اور نہتے کی جان لینا بدترین جرم ہے۔ اس دوران اس کے چہرے پر ایک لمحے زردی چھا جاتی تو دوسرے لمحے سرخی۔ لیکن ایک بات کو دوسری کے پردے میں چھپانے کی اس مسلسل باگ دوڑ نے جلد ہی اسے ہلکان کر دیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جس حالت میں وہ ہے اس میں بہترین صورت یہ ہو گی کہ تہہ خانے میں چھپ جائے۔ چنانچہ اس نے ایک دن تہہ خانے میں گزارا' ایک رات اور اگلا دن بھی' مارے سردی کے سارا جسم اکڑ سا گیا اور وہ اندھیرا ہوتے ہی چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ساری رات اس نے کمرے کے وسط میں چپ چاپ کھڑے کھڑے' آوازوں پر کان لگائے کاٹ دی۔ صبح ہی صبح آتش دان بنانے والے کچھ افراد مکان مالکن کے پاس آئے۔ ایوان دمیترچ کو ٹھیک ٹھیک معلوم تھا کہ یہ لوگ باورچی خانے کے آتش دان کی مرمت کرنے آئے ہیں لیکن خوف نے سرگوشی کی کہ ہو نہ ہو یہ پولیس والے ہی ہیں جنہوں نے بھیس بدل رکھا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اسے نہ کوٹ پہننے کا ہوش رہا نہ ٹوپی' دبے پاؤں گھر سے نکلا اور انتہائی سراسیمگی کے عالم میں سڑک پر بھاگ کھڑا ہوا۔ بھونکتے ہوئے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے' کسی شخص نے چلا کے اسے پکارا' ہوائیں اس کے کانوں میں سیٹیاں بجانے لگیں اور ایوان دمیترچ کو لگا کہ دنیا کا سارا تشدد یکجا ہو کر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

اسے روک کر گھر واپس لایا گیا اور مکان مالکن نے ڈاکٹر بلوایا۔ ڈاکٹر اندریئی یفیمچ

نے جس کے متعلق آگے چل کر کچھ اور بتایا جائے گا' علاج کے طور پر ٹھنڈے پانی سے تر پٹیاں اور لارل کی پتیوں کا عرق تجویز کیا' اداسی سے سر ہلایا اور مکان مالکن سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ دوبارہ نہ آئے گا اور یہ کہ لوگوں کو پاگل ہو جانے سے روکنے کی کوشش بے سود ہے۔ ایوان دمیترچ کے پاس گزر بسر اور علاج کے مصارف برداشت کرنے کے لئے رقم نہ تھی' اس لئے اسے اسپتال بھیج دیا گیا جہاں اسے جنسی بیماریوں کے مریضوں کے وارڈ میں جگہ مل گئی۔ وہ رات کو سوتا نہیں تھا' چڑچڑا پن دکھاتا اور دوسرے مریضوں کے آرام میں خلل ڈالتا تھا اس لئے جلد ہی اندرےئی یفیمچ کے حکم سے اسے وارڈ نمبر 6 میں پہنچا دیا گیا۔

سال ہی بھر میں قصبے نے ایوان دمیترچ کو فراموش کر دیا اور اس کی کتابیں جنہیں مکان مالکن نے سائبان تلے ایک برف گاڑی پر کوڑے کی طرح ڈھیر کر دیا تھا' پڑوسی لڑکے اٹھا لے گئے۔

ایوان دمیترچ کا بایاں پڑوسی تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' وہی یہودی موئے سینکما ہے اور دائیں جانب ہے بالکل کورے' انتہائی مہمل چہرے والا ایک موٹا تازہ' چکنا چپڑا کسان' ایک کاہل' پیٹو اور گندہ جانور جو عرصہ ہوا بھول چکا ہے کہ سوچنا یا محسوس کرنا کس کو کہتے ہیں اور جس کے جسم سے دم گھونٹ دینے والی تیز بدبو پھوٹتی رہتی ہے۔

نیکیتا جس کے فرائض میں اس شخص کی دیکھ بھال کرنا بھی شامل ہے' اپنی ساری قوت کے ساتھ بڑے وحشیانہ انداز میں اس کی پٹائی کرتا اور اپنے مکوں میں چوٹ لگ جانے کی بھی پروا نہیں کرتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ اس شخص کا یوں کچومر نکالا جاتا ہے' اتنی تکلیف دہ نہیں ہے۔ آدمی ایسی چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے...... جتنی یہ کہ اپنی پٹائی پر یہ مخبوط الحواس درندہ کسی آواز اور اشارے سے یا پلک جھپکا کر بھی کوئی ردعمل نہیں ظاہر کرتا ہے' بس کسی وزنی پیپے کی طرح ادھر ادھر جھولتا رہتا ہے۔

وارڈ نمبر 6 کا پانچواں اور آخری باسی ایک مقامی آدمی ہے جو کبھی ڈاک خانے

میں ڈاک چھانٹنے کا کام کیا کرتا تھا۔ دبلا پتلا جسم' بھورے بھورے چھدرے بال اور نیک لیکن ذرا شرارتی سا چہرہ۔ ذہین آنکھوں میں اطمینان اور خوشی کی جھلک کہہ رہی ہے کہ اسے اپنا خیال رکھنا آتا ہے اور سینے میں کوئی بڑا اہم اور پر مسرت راز چھپائے رہتا ہے' کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتا لیکن اس اندیشے سے نہیں کہ کوئی اسے چھین پر چرا لے گا بلکہ محض اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور دوسروں کی طرف پیٹھ کیے کسی چیز کو اپنے سینے پر لٹکا کے اسے دیکھنے لگتا ہے۔ ان لمحات میں کوئی دوسرا اس کے پاس پہنچ جاتا ہے تو وہ جلدی سے اس چیز کو سینے سے ہٹا لیتا اور بری طرح بوکھلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے راز کو تاڑ لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

"آپ مجھے مبارکباد دیجئے نا" کبھی کبھی وہ ایوان دمیترچ سے کہتا ہے۔ "مجھے دوسرے درجے کا ستارے والا استاسلاؤس تمغہ دیئے جانے کی سفارش کی گئی ہے۔ دوسرے درجے کا ستارے والا یہ تمغہ ویسے تو بس غیر ملکیوں ہی کو دیا جاتا ہے لیکن وہ لوگ کسی وجہ سے میرے معاملے میں کوئی رعایت کرنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ مسکرا کر شانے اچکاتے ہوئے اضافہ کرتا ہے: "میں نے تو اس کا تصور تک نہیں کیا تھا!"

"میں ان معاملات میں بالکل ہی کورا ہوں" ایوان دمیترچ تلخی سے جواب دیتا ہے۔

"لیکن آپ کو معلوم بھی ہے کہ دیر سویر مجھے کیا ملنے والا ہے؟" سابق ڈاک چھانٹنے والا عیاری کے ساتھ آنکھوں کو ذرا بھینچ کے بات جاری رکھتا ہے۔ "یقیناً مجھے سوئیڈن کا "قطب تارا" دیا جائے گا۔ ایسے تمغے کے لئے تو انسان تھوڑی سی زحمت بھی گوارہ کر سکتا ہے۔ سفید صلیب اور سیاہ ربن' کتنا خوبصورت ہوتا ہے!"

زندگی میں اتنی زیادہ یک رنگی کا ہے کو اور کہیں شاید ہی ہو گی جتنی اسپتال سے ملحق اس چھوٹی سی عمارت میں ہے۔ ہر روز صبح کو فالج کے مریض اور مٹلے کسان کو چھوڑ کر اور سب مریض برآمدے میں جا کے ایک زبردست کٹھرے میں منہ ہاتھ دھوتے اور اسپتالی لبادوں کے دامنوں سے انہیں پونچھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خاص عمارت سے ٹین کے

ڈونگوں میں نیکیتا کی لائی ہوئی چائے پیتے ہیں۔ دوپہر کو انہیں کھانے میں ترش کرم کلے کا شوربا اور جو کا دلیا ملتا ہے اور شام کو دن کا بچا ہوا وہی دلیا۔ دونوں وقت کے کھانے کے درمیانی وقفے میں یہ لوگ اپنے پلنگوں پر لیٹے رہتے ہیں' سوتے رہتے ہیں' کھڑکیوں سے باہر تکتے یا کمرے میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ اور یہ روز کا معمول ہے۔ سابق ڈاک چھانٹنے والا ہمیشہ بس اپنے انہی تمغوں ہی کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔

وارڈ نمبر 6 میں کوئی نیا چہرہ شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نئے دماغی مریضوں کی بھرتی کبھی کا بند کر چکا ہے اور پاگل خانے میں کسی کو دیکھنے کے لئے آنے کی فکر باہری دنیا کے ذرا کم ہی لوگوں کو ہوتی ہے۔ دو مہینوں میں ایک بار حجام سیمیون لازارچ البتہ وارڈ میں قدم رکھتا ہے۔ وہ مریضوں کے بال کس طرح کاٹتا ہے' اس کام میں اس کی مدد نیکیتا کس ڈھنگ سے کرتا اور نشے میں دھت مسکراتے ہوئے حجام کو دیکھ کر مریضوں پر اچانک کیسا ہول طاری ہو جاتا ہے۔ اس سب کی تفصیل میں ہمارا نہ جانا ہی بہتر ہے۔

حجام کے سوا یہاں اور کوئی بھی اپنی صورت نہیں دکھاتا ہے۔ مریضوں کو روز اسی مصیبت کو جھیلنا پڑتا ہے جس کا نام نیکیتا ہے۔ ویسے ادھر کچھ دنوں سے البتہ اسپتال میں ایک عجیب وغریب افواہ اڑنے لگی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وارڈ نمبر 6 میں ڈاکٹر پابندی سے جانے لگا ہے۔

واقعی کتنی عجیب وغریب ہے یہ افواہ بھی!

ڈاکٹر اندریئی یفیمچ راگین اپنے پیشے کے اعتبار سے خاصا ممتاز شخص ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں بہت مذہبی تھا' پادری بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا اور اس سلسلے میں 1863ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کلیسائی اکیڈمی میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باپ نے جو ڈاکٹر آف سائنس اور سرجن تھا' آڑے ہاتھوں لیا' کہنے لگا: "ادھر تم پادری بنے اور ادھر میں نے تم کو عاق کیا۔" مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کتنی صداقت ہے لیکن اندریئی یفیمچ کو اکثر یہ کہتے ضرور سنا ہے کہ ڈاکٹر بننے یا سائنس

کے کسی دوسرے میدان میں کام کرنے کی طرف اس کی طبیعت ذرا بھی مائل نہ تھی۔

حقیقت کچھ بھی رہی ہو بہر حال ڈاکٹری کی سند لینے کے بعد وہ پادری نہ بنا۔ اپنی دین داری کے لئے تو خیر وہ کبھی بھی مشہور نہ تھا اور اس میں کسی پادری کی صفات ڈاکٹری شروع کرنے کے زمانے میں بھی بس اتنی ہی تھیں جتنی کہ اب ہیں۔

اس کی وضع قطع بھدی اور اکھڑ کسانوں کی سی ہے' چہرہ' داڑھی' سیدھے بال اور طاقتور بے ڈول جسم کسی سڑک کے کنارے والے ریستوران کے شکم سیر' ضدی اور سخت مزاج مالک کی یاد دلاتے ہیں۔ نیلی نیلی رگوں کے جال سے ڈھکا ہوا بدنما چہرہ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور سرخ ناک۔ قد لمبا ہے' شانے چوڑے چکلے اور ہاتھ پاؤں بہت بڑے بڑے' لگتا ہے کہ کسی بیل پر زوردار مکا رسید کردے تو بیچارا ڈھیر ہو جائے۔ لیکن اس کی چال سے البتہ عجب نرمی اور احتیاط جھلکتی ہے' چوروں کی طرح دبے دبے قدم اٹھاتا ہے: تنگ گزرگاہ میں کسی کا سامنا ہو جاتا ہے تو ٹھہر کے راستہ دینے میں پہل ہمیشہ وہی کرتا اور "معاف کیجئے گا!" کہتا ہے لیکن بھاری آواز میں نہیں جیسا کہ آپ توقع کررہے ہوں گے بلکہ دھیمی اور نرم آواز میں۔ گردن پر چھوٹی سی رسولی ہونے کی بنا پر بہت سخت کالر استعمال نہیں کرسکتا' اس لئے ہمیشہ ہی سن کے کپڑے کی یا سوتی نرم قمیصیں ہی پہنتا ہے۔ عام ڈاکٹروں جیسی خوش لباسی سے اسے دور کی بھی نسبت نہیں۔ ایک ہی سوٹ میں دس سال کاٹ دیتا ہے اور نیا سوٹ بھی جسے وہ عموماً یہودی والی بنے بنائے کپڑے کی دوکان سے خریدتا ہے' اس کے جسم پر پہنچ کر اسی سابق سوٹ کی طرح پرانا اور ملگجا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی ایک سوٹ کو پہنے پہنے وہ مریضوں کو دیکھتا ہے' کھانا کھاتا ہے اور دوستوں کے ہاں جاتا ہے' پر اس کے پیچھے اس کی کنجوسی یا کسی اور بات کا نہیں صرف اپنی وضع قطع کی طرف سے یکسر لاپروائی کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔

اندریئی یفیمچ اپنا عہدہ سنبھالنے کے لیے قصبے میں آیا تو یہ "خیراتی ادارہ" عجب زبوں حالی کا شکار تھا۔ وارڈوں' ان کی درمیانی گزرگاہوں اور اسپتال کے احاطے میں بدبو کے مارے سانس لینا محال تھا۔ اسپتال کے خدمت گار' نرسیں اور ان کے افراد

خاندان وارڈوں میں مریضوں کے ساتھ رات بسر کیا کرتے تھے۔ ہر شخص شاکی تھا کہ تل چٹوں، کھٹملوں اور چوہوں نے زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ سرجیکل شعبہ حمرہ کے مریضوں سے کبھی بھی خالی نہیں رہتا تھا۔ سارے اسپتال میں آپریشن کرنے کے چاقو صرف دو تھے، تھرمامیٹر ایک بھی نہیں تھا اور غسل کرنے کے ٹب آلو رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ، میٹرن اور طبی معاون مریضوں کی غذا ہتھیا لیتے تھے اور جہاں تک اس بوڑھے ڈاکٹر کا تعلق ہے جو اندریئی یفیمچ سے پہلے اس عہدے پر مامور تھا تو کہا جاتا تھا کہ وہ اسپتال کو ملنے والی اسپرٹ چوری چھپے بیچ لیا کرتا تھا اور اس نے اپنے لئے منتخب نرسوں اور مریضاؤں کا اچھا خاصا حرم سا قائم کر رکھا تھا۔ قصبے کے لوگوں سے یہ ساری شرمناک صورت حال کچھ ڈھکی چھپی نہ تھی، وہ تو اسے بڑھا چڑھا کے بھی بیان کیا کرتے تھے لیکن کچھ کرنے کرانے کی فکر جیسے کسی کو بھی نہ تھی۔ کچھ لوگ تو یہ کہہ کے معاملے کو ٹال دیتے تھے کہ اسپتال میں کسانوں اور نچلے طبقوں کے مریضوں ہی کا تو علاج ہوتا ہے اور انہیں کوئی شکایت کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ان کے گھروں کے حالات اسپتال سے کہیں بدتر ہیں: ایسے کنگالوں کو تیتر کھلائے جائیں کیا؟ دوسروں کی دلیل یہ تھی کہ قصبے سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ زیمستوو کی امداد کے بغیر کوئی ٹھکانے کا اسپتال چلاتا رہے۔ لوگوں کو تو احسان مند ہونا چاہئے کہ اسپتال قائم ہے، خراب ہے تو کیا ہوا۔ اور زیمستوو نے جس کے قیام کو خود ہی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، قصبے یا قرب و جوار میں اپنا اسپتال نہ کھولا کیونکہ جیسا کہ ان لوگوں کا کہنا تھا، ایک اسپتال تو موجود ہی تھا۔

اندریئی یفیمچ نے پہلے ہی روز اسپتال کے معائنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ یہ تو بدمعاشی کا اڈا اور صحت عامہ کے لئے انتہائی مضر ادارہ ہے۔ اس نے سوچا، بہترین بات یہ ہوگی کہ مریضوں کو چھٹی دے کر اسپتال میں تالا ڈال دیا جائے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسپتال بند کر دینے کے لئے خالی اسی کی خواہش نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ درکار ہوگا اور ویسے اس سے کچھ حاصل بھی نہ ہوگا۔ ایک جگہ کی تمام اخلاقی اور مادی غلاظتوں کو جھاڑ بہار کر الگ کر دیا جاتا ہے تو وہ یقیناً کسی دوسری جگہ ڈھیر ہو جاتی ہے، آدمی کو اس

وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب یہ غلاظتیں خود بخود کافور ہو جائیں۔ یہ بات بھی سوچنے کی تھی کہ یہاں کے لوگوں نے اسپتال کھولا ہے' اسے برداشت کیے جا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس کی ضرورت بھی ہے۔ جاہلانہ تعصب اور روزمرہ زندگی کی یہ ساری غلاظت اور گھناؤنے افعال ضروری ہیں کیونکہ وقت آنے پر انہیں کسی کام کی چیز میں تبدیلی کیا جا سکے جیسے کہ گوبر زرخیز مٹی میں بدل جاتا ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی لطافت نہیں جس نے کثافت کے پیٹ سے جنم نہ لیا ہو۔

اندریئی یفیمچ نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اسپتال کی اس ساری بدنظمی کی طرف سے ایک لحاظ سے آنکھیں ہی بند کرلیں۔ اس نے خدمت گاروں اور نرسوں کو وارڈوں میں رات بسر کرنے سے روک دیا' آپریشن کے آلات رکھنے کے لئے دو الماریاں منگوالیں اور بس۔ سپرنٹنڈنٹ' میٹرن اور حجرہ کے مریض سب اپنی اپنی جگہ پر پہلے ہی کی طرح ڈٹے رہے۔

اندریئی یفیمچ عقل مندی اور ایمان داری کی بے حد قدر کرتا ہے لیکن خود اپنے اردگرد کی زندگی کو عقل مندی اور ایمانداری کی بنیادوں پر منظم کرنے کے لیے نہ اس کے اندر کردار کی قوت ہے اور نہ ہی اپنے حقوق پر اعتماد۔ حکم دینے' کسی بات پر روک لگانے اور کسی فیصلے کو اصرار کر کے منوانے کے لئے دراصل وہ بنا ہی نہیں ہے۔ لگتا ہے جیسے اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی بھی نہ اپنی آواز اونچی کرے گا نہ تحکمانہ لہجہ اپنائے گا۔ "مجھے دیجئے" یا "میرے لئے لے آیئے" کہتے ہوئے جیسے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہو۔ بھوک لگتی ہے تو ہچکچاہٹ کے ساتھ کھانستا اور اپنی باورچن سے کہتا ہے: "چائے کیسی رہے گی؟......" یا "کھانے کے متعلق کیا خیال ہے؟" اور جہاں تک سپرنٹنڈنٹ کو چوری سے منع یا اسے برطرف کر دینے یا اس غیر ضروری عہدے کو سرے سے ختم ہی کر دینے کا سوال ہے تو یہ باتیں بالکل اس کے بس ہی کی نہیں ہیں۔ لوگ اندریئی یفیمچ سے جھوٹ بولتے ہیں' چاپلوسی کرتے یا کسی صریحاً جعلی حساب کو اس کے پاس دستخط کرانے کے لئے لاتے ہیں تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور وہ خود کو مجرم تصور کرتے ہوئے جلدی سے کاغذ

پر دستخط کر دیتا ہے۔ مریض اس سے بھوکے ہونے یا عملے کے ظالمانہ رویے کی شکایت کرتے ہیں تو وہ بوکھلا جاتا ہے اور بڑے معذرتی انداز میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے:

''اچھی بات ہے' میں اس معاملے کو دیکھ لوں گا......ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی......''

ابتدائی ایام میں اندریئی یفیمچ نے بڑے جوش و خروش سے کام کیا' دن کے کھانے کے وقت تک باہری مریضوں کو دیکھتا' آپریشن کرتا اور بچوں کی ولادت کے معاملات تک نپٹاتا رہتا تھا۔ عورتیں کہتی تھیں کہ وہ مریضوں پر بہت توجہ مبذول کرتا ہے اور بیماریوں خاص طور پر عورتوں اور بچوں کی بیماریوں کی تشخیص کے معاملے میں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ پر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ اکتا دینے والی یکسانیت اور کام کے صریحی طور پر غیر موثر ہونے کی وجہ سے بددل ہوتا گیا۔ ایک روز اسے تیس مریض دیکھنے پڑتے' دوسرے روز پینتیس اور تیسرے روز چالیس۔ اور یہ سلسلہ روز بہ روز' سال بہ سال یونہی جاری رہا' قصبے کی شرح اموات گھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور ہمیشہ ہی نئے مریضوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ہر صبح کو جو چالیس مریض اسپتال آتے تھے ان سب کی حالت پر غور سے توجہ دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا' جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لاکھ جتن کیوں نہ کرتا اس کا کام محض ڈھونگ ہی تھا۔ کسی سال کے دوران اگر وہ 12000 باہری مریضوں کو دیکھتا تھا تو اس کا مطلب دو اور دو چار کے حساب سے بھی صرف یہی ہوتا تھا کہ 12000 مردوں اور عورتوں کو فریب دیا گیا۔ یہ نہیں' جن مریضوں کی حالت خراب ہوتی انہیں اسپتال میں بھرتی کر کے سائنسی اصولوں سے علاج کرنا بھی ناممکن تھا کیونکہ اصول تو بہت سے تھے مگر سائنس کا کہیں نام ونشان نہ تھا اور فلسفے سے قطع نظر صرف اصولوں ہی کی دوسرے ڈاکٹروں جیسے اصول پرستانہ انداز میں پابندی نے سب سے پہلے مطالبہ کیا ہوتا غلاظت کا نہیں بلکہ صفائی اور تازی ہوا کے انتظام کا' ترش کرم کلے کے بدبودار شوربے کا نہیں بلکہ صحت بخش غذا کا' چوروں کا نہیں بلکہ ہمدرد خدمت گاروں کا۔

وہ یہ بھی سوچتا کہ جب زندگی کا عام اور جائز انجام موت ہی ہے تو آخر لوگوں کو مرنے سے روکا کیوں جائے؟ کسی دوکان دار یا کلرک کی زندگی میں پانچ دس برسوں کا اضافہ ہی ہو جائے تو اس سے حاصل کیا؟ اور اگر معالجے کا مقصد دوائیں دے کر تکلیف کو کم کرنا ہے تو ناگزیر طور پر سوال اٹھتا ہے: تکلیف کو آخر کم کیوں کیا جائے؟ اوّل تو تکلیف کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حصول کاملیت میں انسان کی مدد کرتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بنی نوع انسان نے گولیوں اور سفوف کے ذریعے تکلیف کو کم کرنا سیکھ لیا تو لوگ مذہب اور فلسفے کو بالائے طاق رکھ دیں گے جن میں انہیں اب تک صرف تمام برائیوں سے نجات ہی نہیں بلکہ خود مسرت بھی ملتی رہی ہے۔ پشکن نے بستر مرگ پر تڑپا دینے والی تکالیف برداشت کیں ہیں۔ انتقال سے قبل برسوں مفلوج پڑا رہا تو پھر کوئی اندریئی یفیمچ یا کوئی ماتریونا ساوشنا جس کی حقیر زندگی کی تکلیف سے محروم ہو کر سب سے چھوٹے کیڑے کی زندگی جیسی غیر اہم ہو جائے گی' آخر تکلیف سے نجات کیوں پائے؟

اس قسم کے خیالات سے مغلوب ہو کر اندریئی یفیمچ بددلی کا شکار ہو گیا اور اس نے اسپتال ہر روز جانا بند کر دیا۔

(

اس کا روز کا معمول کچھ یوں ہے۔ صبح کو تقریباً آٹھ بجے اٹھ کر کپڑے پہنتا اور چائے پیتا ہے۔ پھر وہ یا تو اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھنے لگتا ہے یا اسپتال چلا جاتا ہے۔ اسے وارڈوں کی درمیانی تنگ اور تاریک گزرگاہ میں باہری مریض بھرتی کیے جانے کا انتظار کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے قریب سے اسپتال کی خادمائیں اور خدمت گار اینٹوں کے فرش پر اپنے اپنے لانگ بوٹوں سے کھٹ کھٹ کرتے تیزی سے گزرتے ہوتے ہیں' بھرتی مریض لاغر جسموں کو لبادوں میں لپیٹے ادھر ادھر ٹہلتے رہتے ہیں' لاشیں اور رات کی آلائش کے برتن باہر نکالے جا رہے ہوتے ہیں' بچوں کے رونے کی آوازیں گونجتی ہوتی ہیں اور تیز ہوا کے جھونکے گزرگاہ کو جھنجھوڑتے

سے معلوم ہوتے ہیں۔ اندریئی یفیمچ کو بخوبی احساس ہوتا ہے کہ اس قسم کے حالات، بخار دق یا محض اعصابی بیماریوں کے مریضوں کے لئے سخت اذیت دہ ہوتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟ خیر مقدمی کمرے میں ایک گول مٹول پستہ قد، پھولے پھولے سے، اچھی طرح شیو کیے اور خوب دھلے ہوئے چہرے والا خوش اخلاق آدمی سرگیئچ جو اس کا نائب ہے لیکن اپنے نئے، ذرا ڈھیلے سے سوٹ اور وضع قطع کے ساتھ طبی معاون سے کہیں زیادہ کسی سینیٹ کا ممبر معلوم ہوتا ہے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ قصبے میں اس کی نجی پریکٹس زوروں کے ساتھ چل رہی ہے، سفید ٹائی باندھتا اور خود کو ڈاکٹر سے زیادہ قابل تصور کرتا ہے جس کی کوئی نجی پریکٹس نہیں ہے۔ اس کمرے کے ایک گوشے میں پردے کے ذریعے مقدس تصویر لگانے کی مخصوص جگہ بنائی گئی جہاں بڑی سی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے بھاری بھرکم آہنی لیمپ لٹک رہا ہے اور قریب ہی سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی نذر کی موم بتیوں کے لئے ایک شمع دان رکھا ہوا ہے۔ بشپوں کی تصاویر، سویا تو گورسک خانقاہ کی ایک تصویر اور خشک پھولوں کے ہار دیواروں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ سرگیئی سرگیئچ بڑا مذہبی آدمی اور کلیسائی آداب کا کٹر حامی ہے۔ اسپتال میں مقدس تصویر اسی نے رکھوائی تھی۔ ہر اتوار کو وہ کسی مریض سے دعا پڑھواتا ہے جس کے بعد وہ خود مختلف وارڈوں میں جاتا اور عود دان کو آگے پیچھے ہلا ہلا کر عود کی خوشبو پھیلاتا ہے۔

مریض بہت ہوتے ہیں اور وقت کم، اس لئے ڈاکٹر ہر مریض سے جلدی جلدی چند سوال پوچھ کے دوا کے طور پر عموماً لیپ کے ساتھ مالش یا کیسٹر آئل تجویز کر دیتا ہے اور بس۔ اندریئی یفیمچ اپنی مٹھی پر سر ٹکا کے خیالوں میں غرق ہو جاتا ہے اور میکانکی انداز میں مریضوں سے سوالات کرنے لگتا ہے۔ سرگیئی سرگیئچ بھی پاس ہی بیٹھا ہوا ہاتھ ملتا رہا ہے اور کبھی کبھار بول پڑتا ہے۔ "ہم بیماریوں اور افلاس کی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں،" وہ کہتا ہے "کیونکہ خدائے رحیم و کریم کی عبادت نہیں کرتے۔ یہ ہے قصہ۔"

اندریئی یفیمچ باہری مریضوں کو کو دیکھتے وقت کوئی آپریشن نہیں کرتا۔ آپریشن

کرنے کی عادت جانے کبھی کی چھوٹ چکی ہے اور اب تو وہ خون کو دیکھ کے بھی بوکھلا جاتا ہے۔ اسے کسی بچے کا منہ کھول کر حلق دیکھنا پڑتا ہے اور بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے الگ دھکیلنے کی کوشش کرتا اور چیخنے چلانے لگتا ہے تو اندریئی یفیمیچ کا سر چکرانے لگتا ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ جلدی جلدی نسخہ لکھتے ہی اپنے ہاتھوں کو لہرا کر ماں کو اشارہ کرتا ہے کہ اسے لے جاؤ۔

وہ جلد ہی مریضوں کے بودے پن اور حماقت سے، مذہبی رسوم کے دلدادہ سرگئی سرگیئچ کی موجودگی سے دیواروں پر آویزاں تصاویر سے اور خود اپنے سوالات سے عاجز آ جاتا ہے جن میں وہ گزشتہ بیس برسوں میں کوئی تنوع پیدا نہیں کر سکا۔ آخر پانچ چھ مریضوں کو دیکھنے کے بعد وہ گھر لوٹ جاتا ہے۔ باقیوں کو اس کا نائب دیکھتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی وہ اس خوشگوار احساس کے ساتھ کہ خدا کا شکر ہے نجی پریکٹس سے عرصہ ہوا دامن چھڑا چکا ہے اور کوئی اسے دق کرنے نہ آئے گا اپنی کتابوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ مطالعہ وہ بہت کرتا ہے اور ہمیشہ ہی بہت خوشی خوشی۔ اس کی نصف تنخواہ کتابوں ہی پر نکل جاتی ہے اور گھر کے چھ کمروں میں سے تین کتابوں اور پرانے رسالوں ہی سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے ہیں۔ اس کے مطالعے کا محبوب میدان تاریخ اور فلسفے کا ہے صرف ایک ہی طبی رسالے ''ڈاکٹر'' کا وہ خریدار ہے جس کا مطالعہ ہمیشہ ہی آخری صفحے سے شروع کرتا ہے۔ وہ گھنٹوں مسلسل پڑھتا ہے اور ذرا بھی تھکن نہیں محسوس کرتا۔ لیکن اس کے مطالعے میں جلدی جلدی ورق الٹنے کا وہ انداز نہیں پایا جاتا جو کسی زمانے میں ایوان دمیترچ کا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سمجھ سمجھ کر پڑھتا ہے اور اکثر ان جگہوں پر ٹھہر جاتا ہے جو اسے مسرت عطا کرتی یا سمجھنے میں دشوار ثابت ہوتی ہیں۔ کتاب کے پاس ہی شیشے کی صراحی میں وادکا رکھی رہتی ہے اور میز کی باناتی بالائی سطح پر اس کے ٹھیک سامنے نمک لگا کر کھیرا یا کوئی مسالے دار سیب۔ وہ ہر نصف گھنٹے کے بعد صفحے سے نظریں ہٹائے بغیر ہی شراب گلاس میں انڈیل کے پی لیتا ہے، ٹٹول کے کھیرے کو اٹھاتا اور اس کا ٹکڑا کاٹ کر کھانے لگتا ہے۔

تین بجے چپکے چپکے باورچی خانے کے دروازے پر پہنچ کر دھیرے سے کھانستا اور کہتا ہے:

"ارے واریا' کھانے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

بدسلیقگی سے لگائے ہوئے بے ذائقہ کھانے سے نپٹ کر اندریئی یفیمچ دونوں بازوؤں کو سینے پر موڑے موڑے مختلف کمروں میں ٹہلنا اور سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ دیواری گھڑی چار بجاتی ہے پھر پانچ مگر اندریئی یفیمچ کے ٹہلنے اور سوچنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باورچی خانے کا دروازہ چرمراتا اور واریا کا لال لال بدنما چہرہ نمودار ہوتا ہے۔

"اندریئی یفیمچ' آپ کو بیئر تو نہ چاہیے؟" وہ ذرا تشویش بھرے لہجے میں پوچھتی ہے۔

"نہیں! ابھی وقت نہیں ہوا" وہ جواب دیتا ہے۔ "ذرا دیر بعد....."

شام ہونے لگتی ہے تو پوسٹ ماسٹر میخائیل آویریانچ' قصبے کا واحد شخص جس کی رفاقت اندریئی یفیمچ کو گراں نہیں گزرتی' اس سے ملنے آتا ہے۔ یہ میخائل آویریانچ اپنے اچھے دنوں میں دولت مند زمیندار تھا' گھڑ سوار دستے میں بھی خدمات انجام دی تھیں لیکن برے دن دیکھے تو ایسے کہ دو وقت کی روٹی کے لیے بڑھاپے میں ڈاک خانے میں نوکری کرنا پڑی۔ دیکھنے میں تندرست اور توانا' مہذب اور شائستہ' آواز کافی اونچی لیکن خوشگوار۔ بڑا نیک اور زود حس آدمی ہے' پر مزاجاً کافی تند و تیز۔ ڈاک خانے جانے والے کسی شخص نے ادھر کسی بات پر اختلاف ظاہر کیا یا یوں ہی کوئی بحث چھیڑ دی اور ادھر میخائل آویریانچ کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا' جسم کانپنے لگا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گرجدار چیخ سارے ماحول میں گونج اٹھتی ہے: "خاموش!" یہی وجہ ہے کہ ڈاک خانے کو عرصے سے ناقابل تسخیر قلعہ تصور کیا جاتا ہے۔ میخائل آویریانچ اندریئی یفیمچ کی علمیت' شرافت اور وسیع الخیالی کی وجہ سے اسے پسند اور اس کی عزت کرتا ہے لیکن باقی سب کو کم تر سمجھتا اور حقارت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔

"یہ لیجئے! میں آ دھمکا!" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زور سے چلاتا ہے۔" کہئے! کیا حال ہے میرے دوست؟ شاید آپ مجھ سے تنگ آ چکے ہوں گے ہے نا؟"

"بالکل نہیں، بالکل نہیں" ڈاکٹر جواب دیتا ہے۔ "آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

دونوں دوست مطالعے کے کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر ذرا دیر تک خاموشی سے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔

"بھئی واریا، کچھ بیئر پی جائے تو کیسا رہے؟" ڈاکٹر پوچھتا ہے۔

پہلی بوتل اسی خاموشی کے عالم میں خالی کر دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اداس اور کھویا کھویا سا نظر آتا ہے جبکہ میخائیل آوریانچ انتہائی خوش وخرم، بالکل اسی شخص کے جیسا جو ہنسنے ہنسانے والی بات کہنے جا رہا ہو۔ گفتگو کا آغاز عموماً ڈاکٹر ہی کرتا ہے۔

"ہے نا افسوس کی بات!" وہ سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اور اپنے دوست کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر (کسی کے چہرے کی طرف وہ کبھی دیکھتا ہی نہیں) نیچی آواز میں دھیرے دھیرے کہنا شروع کرتا ہے۔ "میں کہتا ہوں، عزیز دوست میخائل آوریانچ، ہے نا افسوس کی بات کہ ہمارے قصبے میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جسے دلچسپ اور دانشورانہ گفتگو کی ذرا بھی فکر ہو یا جو اس کی اہلیت رکھتا ہو؟ یہ ہماری بہت بڑی محرومی ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقات بھی حقیر چیزوں سے بلند نہیں ہو پاتے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کا ذہنی ارتقاء بھی کسی لحاظ سے نچلے طبقات سے بہتر نہیں۔"

"سچ ہے۔ میں سو فیصدی متفق ہوں۔"

"یقیناً آپ جانتے ہی ہیں" ڈاکٹر اسی انداز سے دھیرے دھیرے بات جاری رکھتا ہے" کہ ذہن انسانی کے اعلیٰ وارفع روحانی اظہارات کے سوا دنیا کی ہر شے غیر اہم اور غیر دلچسپ ہے۔ یہ ذہن ہی تو ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان حد بندی کی لکیر کھینچتا ہے، اول الذکر کی مقدس فطرت کی جھلک دکھاتا اور ایک لحاظ سے غیر موجود حیات ابدی کی جگہ بھی لے لیتا ہے۔ اس تمہید سے آگے بڑھیے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ذہن ہی

مسرت کا واحد وسیلہ ہے۔ ہم اپنے ماحول میں ذہن جیسی کسی شے کو نہ دیکھتے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنتے ہیں' جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسرتوں سے محروم ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ کتابیں ہماری رفیق ہیں لیکن کتابیں گفتگو اور نجی رابطے کی جگہ تو نہیں لے سکتیں۔ اگر مجھے آپ ایک استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ یہ زیادہ خوشگوار نہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ کتابیں مطبوعہ موسیقی ہیں اور گفتگو۔ گانا۔''

''بالکل سچ ہے۔''

خاموشی چھا جاتی ہے۔ واریا چہرے پر بے زبان غم کے تاثر کے ساتھ باورچی خانے سے نکل کے دروازے میں آ کھڑی ہوتی ہے اور رخسار کو مٹھی پر ٹکا کر سننے لگتی ہے۔

''آہ'' میخائل آوریانچ ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔'' اور آپ کا خیال ہے کہ ان دنوں لوگوں کی کھوپڑی میں ذہن بھی ہوتے ہیں!''

اور وہ اگلے وقتوں کا ذکر چھیڑ دیتا ہے جب زندگی صحت مند' پر مسرت اور دلچسپ تھی' قدیم روس کے تعلیم یافتہ طبقات کی باتیں کرنے لگتا ہے جو آن بان اور دوستی پر جان دیتے تھے۔ لوگ کسی لکھا پڑھی کے بغیر ہی رقمیں ادھار دے دیا کرتے تھے اور کسی دوست کی پریشانی میں کام نہ آنے کو انتہائی شرمناک بات تصور کیا جاتا تھا۔ فوجی معرکے' مہمیں' جھڑپیں' دوستیاں' عورتیں! اور قفقاز۔ کیا شاندار سرزمین تھی! ایک بٹالین کمانڈر کی بیوی بھی کیسی سنکی تھی' افسروں کی یونیفارم پہن کر ہر شام کو تن تنہا گھوڑا دوڑاتی پہاڑوں میں نکل جاتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے کسی کوہستانی گاؤں میں ایک کنیاز سے آشنائی کر رکھی ہے۔

''اوہ! مقدس ماں!......'' واریا ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔

''اور کیسی کیسی مے نوشیاں ہوتی تھیں! کیسی کیسی ضیافتیں! اور کتنے جانباز آزاد خیال تھے ہم لوگ!''

اندرے یفیمچ اس کی باتیں نہ سننے کی طرح سنتا رہتا ہے۔ وہ بیئر کی چسکیاں لے

لے کر کچھ اور ہی سوچا کرتا ہے۔

"میں اکثر ذہین لوگوں کے خوابوں میں کھویا رہتا ہوں' ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں" اچانک وہ بیچ میں بول پڑتا ہے۔ "میرے والد نے مجھے بڑی شاندار تعلیم دلائی تھی لیکن ساتویں دہائی کے خیالوں سے متاثر ہو کر انہوں نے مجھے ڈاکٹری پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ان دنوں میں نے والد کی مرضی کے سامنے سر نہ جھکا دیا ہوتا تو آج کسی دانش ورانہ تحریک میں پیش پیش ہوتا۔ شاید میں اس وقت کسی یونیورسٹی کے تدریسی عملے میں شامل ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ذہن جاوداں نہیں' دوسری تمام چیزوں ہی کی طرح ذہن بھی فانی ہے لیکن میں آپ سے وضاحت کر چکا ہوں کہ اسے اتنی زیادہ اہمیت کیوں دیتا ہوں۔ زندگی ایک مصیبت انگیز کھٹکے دار پنجرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جیسے ہی کوئی دانش ور ذہنی بلوغ کی منزل پر پہنچ کر شعوری غور و فکر کے قابل ہو جاتا ہے ویسے ہی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ایک کھٹکے دار پنجرے کے اندر بند ہو گیا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہیں۔ اگر آپ غور کریں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف اور محض اتفاقی اسباب کی بناء پر عدم وجود سے وجود میں لایا گیا ہے...... کاہے کے لئے؟ اگر وہ اپنے وجود کا مفہوم و مقصد معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یا تو اسے کوئی جواب نہیں ملتا یا پھر طرح طرح کی لغو باتیں بتائی جاتی ہیں۔ وہ بار بار کھٹکھٹاتا ہے لیکن پنجرے کے دروازے کو کوئی بھی نہیں کھولتا اور اسے موت آ جاتی ہے۔ وہ بھی اس کی مرضی کے خلاف ہی۔ اور جس طرح مشترکہ بدبختی سے متحد قیدی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع پا کر ذرا خوش ہو جاتے ہیں اسی طرح تجزیہ و تعمیم کا رجحان رکھنے والے افراد ایک دوسرے کی طرف کھینچتے ہیں اور کھٹکے دار پنجرے میں اپنے بند ہونے کا احساس کئے بغیر بلند اور غیر مفید خیالات کا تبادلہ کر کے وقت کاٹتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ذہن لاثانی اطمینان کا وسیلہ ہے۔"

"بالکل سچ ہے۔"

اندریئی یفیمچ اپنے ہم کلاس سے آنکھیں نہ چار کرتے ہوئے یوں ہی دھیمے'

ہچکچاتے ہوئے لہجے میں ذہین لوگوں اور ان سے گفتگو کر کے حاصل ہونے والی مسرت کے متعلق باتیں کرتا رہتا ہے۔ میخائل آوریانچ غور سے سنتا اور کبھی کبھی اچھے "بالکل سچ ہے" کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔

"لیکن آپ روح کے جاوداں ہونے میں یقین نہیں رکھتے کیا؟" پوسٹ ماسٹر اچانک پوچھ بیٹھتا ہے۔

"نہیں، میرے پیارے میخائل آوریانچ، نہ میں یقین رکھتا ہوں اور نہ ہی اس یقین کے لئے میرے پاس کوئی وجہ ہے۔"

"سچ پوچھئے تو خود مجھے بھی اس کے بارے میں شک ہے۔ اس کے برعکس مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کبھی مروں گا ہی نہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: بڑے میاں، اب تو مرنے کی گھڑی قریب آچلی! لیکن کوئی ذرا سی آواز سرگوشی کرتی ہے: اس پر یقین نہ کرو، تم کبھی نہ مروگے!......"

نو بجے کے کچھ ہی دیر بعد میخائل آوریانچ اس سے رخصت ہوتا ہے۔ وہ بڑے کمرے میں کھڑے کھڑے اپنے بھاری بھرکم کوٹ کو پہنتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کے کہتا ہے:

"ذرا سوچئے نا! قسمت نے ہمیں بھی یہ کس جہنم میں لا پھینکا! اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ ہمیں مرنا بھی یہیں ہوگا! ہونہہ!......"

دوست کو دروازے تک رخصت کرنے کے بعد اندریئی یفیمچ دوبارہ اپنی میز کے پاس بیٹھ کر پڑھنے لگتا ہے۔ اب شب کے سناٹے میں کوئی بھی آواز مخل نہیں ہو رہی ہے، لگتا ہے خود وقت بھی ٹھہر گیا ہے، ڈاکٹر اور اس کی کتاب کو دیکھ رہا ہے جیسے دنیا میں اس کتاب اور سبز شیڈ والے اس لیمپ کے سوا اور کسی شے کا وجود ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر کا کھردرا، دہقانی چہرہ دھیرے دھیرے مسکراہٹ سے جو ذہن انسانی کے اظہارات سے اس کی محبت اور احترام کی آئینہ دار ہے، چمک اٹھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر انسان جاوداں

کیوں نہیں ہے؟ آخر کیوں؟ آخر ذہن کے ان سب مراکز اور تہوں کا 'بصارت' 'گویائی' خود آگاہی اور غیر معمولی ذہانت کا وجود ہی کیوں ہے۔ اگر ان سب کو ایک نہ ایک روز خاک میں مل جانا اور آخر کار قشر ارض کے ساتھ سرد ہو کر کسی مقصد اور سبب کے بغیر ہی اربوں سال تک آفتاب کے گرد گردش کرتے رہنا ہے؟ یقیناً یہ ضروری نہ تھا کہ یوں ہی محض سرد ہونے اور گردش کرتے رہنے کے لئے انسان کو اس کے شاندار تقریباً ملکوتی ذہن کے ساتھ وجود میں لایا جاتا اور پھر اسے جیسے کسی تلخ مسخرے پن کے ساتھ خاک میں تبدیل کر دیا جاتا!

تغیر کامل کسی بزدل کے سوا اور کس کو اس بات سے سکون و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ جاوداں ہونے کے بجائے خاک میں تبدیل ہو جائے؟ قدرت میں غیر شعوری طور پر جو عمل جاری رہتے ہیں وہ تو انسانی حماقت کے عمل سے بھی پست سطح کے ہوتے ہیں کیونکہ حماقت میں بھی کسی حد تک شعور اور مرضی کا دخل ہوتا ہے جبکہ قدرت کے عمل اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں رکھتے۔ صرف کوئی بزدل ہی جس کا موت کا خوف اس کی خود داری سے بڑا ہو' خود کو اس خیال سے تسکین دے سکتا ہے کہ اس کا جسم گھاس کے کسی تنکے میں' کسی پتھر میں' کسی مینڈک میں زندہ رہے گا...... اس تغیر کامل کو حیاتِ ابدی سمجھ بیٹھنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہوگا جتنا کہ کسی وائیلن کے ٹوٹنے اور بیکار ہو جانے کے بعد اسے رکھنے کے خول کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کرنا۔

دیواری گھڑی جب بھی وقت کا اعلان کرتی ہے' اندریئی یفیمچ آرام کرسی سے پیٹھ ٹکا کر اپنے خیالوں پر غور کرنے کے لئے پل بھر کو آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ابھی جو کتاب اس کے زیر مطالعہ تھی اس کے بلند خیالات سے متاثر ہو کر وہ اپنی گزشتہ اور موجود زندگی کا تجزیہ کرنے لگتا ہے۔ ماضی سے اسے نفرت محسوس ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کچھ نہ سوچنے ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ رہا حال سو وہ بھی ماضی ہی جیسا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت جبکہ اس کے خیالات سرد قشر ارض کے ساتھ آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ وسیع عمارت میں اس کے کمروں سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر لوگ بیماری اور

غلاظت سے نڈھال ہوئے جارہے ہیں۔ شاید ٹھیک اسی لمحے کوئی شخص جاگ رہا ہے خود کو کیڑوں مکوڑوں سے بچانے کو کوشاں ہے۔ کسی دوسرے کو ابھی ابھی حمرہ مرض لگ گیا ہے یا زخم پر بہت زیادہ کس کر باندھی جانے والی پٹی کی وجہ سے درد سے کراہ رہا ہے اور شاید کچھ مریض نرسوں کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں اور واڈکا پی رہے ہیں۔ گزشتہ سال 12000 مردوں اور عورتوں کو فریب دیا گیا' سارے اسپتال کی زندگی بیس سال قبل کی طرح آج بھی چوری' دھینگا مشتی' گپ بازی' جانب داری اور شرمناک عطائی پن پر مبنی ہے' اسپتال آج بھی بدمعاشی کا اڈا اور قصبے کے لوگوں کی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ اندریئی یفمیچ کو معلوم ہوا کہ وارڈ نمبر 6 میں آہنی سلاخوں کے پیچھے نیکیتا مریضوں کو زدو کوب کرتا ہے اور موئے سینکما ہر روز گداگری کے لئے سڑکوں پر نکلتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ گزشتہ پچیس برسوں کے دوران علم طب کو حیرت انگیز طور پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران اسے لگتا تھا کہ علم طب کا بھی جلد ہی الکیمیا اور مافوق الطبعیات کا جیسا ہی حشر ہوگا لیکن اب شبینہ مطالعات کے دوران وہی علم طب اسے بے حد متاثر کرتا ہے۔ اور اس کے اندر استعجاب پیدا کرتا ہے جو وجد کے مترادف ہے۔ واقعی کیسی غیر متوقع ذکاوت' کیسا شاندار انقلاب ہے! دافع عفونت ادویات کی بدولت آج ایسے آپریشن کئے جارہے ہیں جنہیں خود عظیم پیروگوف تک نے in spe بھی ناممکن تصور کیا تھا' معمولی زیمستوو ڈاکٹروں تک کو گھٹنے کے جوڑ کا آپریشن کرنے میں ڈر نہیں محسوس ہوتا' پیٹ کے آپریشنوں کے بعد مریضوں میں سے صرف ایک کی موت واقع ہوتی ہے اور پتھری کو تو ایسی معمولی چیز تصور کیا جاتا ہے کہ کسی مطبوعہ مضمون میں ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ آتشک کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا ممکن ہوگیا ہے۔ اور پھر نظریہ توارث ہے' ہپنا ٹزم ہے' پاستیر اور کاخ کی دریافتیں ہیں' ہائی جین' اعداد و شمار اور ہماری روسی زیمستوو طبی تنظیمیں ہیں! مرض کی جدید درجہ بندی کے ساتھ دماغی امراض کا علاج' تشخیص اور معالجے کے طریقے۔ یہ سب کچھ

ماضی کے مقابلے میں ایلبر وس پہاڑ جیسا بلند ہے۔ دماغی مریضوں کو اب نہ سرد پانی سے بھگویا جاتا ہے اور نہ ہی انہیں اتنے زیادہ کسے ہوئے کوٹ پہنائے جاتے ہیں کہ ہاتھ جکڑ جائیں۔ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ ان کی تفریح کے لئے تھیٹر کے پروگرام اور رقص منظم کئے جاتے ہیں۔ اندریئی یفیمچ جانتا ہے کہ جدید خیالات اور ذوق کی بنا پر وارڈ نمبر 6 جیسی لعنت زدہ جگہوں کا وجود اب صرف کسی ایسے قصبے ہی میں ممکن رہ گیا ہے جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی دوسوٹ ورسٹ کے فاصلے پر ہے جہاں میونسپلٹی کا چیئرمین اور ممبران بس برائے نام ہی تعلیم یافتہ ہیں جو ڈاکٹر کو کوئی بڑا بشپ تصور کرتے ہیں' جس کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہنا چاہیئے خواہ وہ مریض کے حلق میں پگھلا ہوا سیسا کیوں نہ انڈیل رہا ہو۔ کوئی دوسری جگہ ہوتی تو شہریوں اور اخباروں نے اس چھوٹے باسٹیل کو کبھی کا مسمار کر دیا ہوتا۔

''لیکن فائدہ کیا ہوا؟'' اندریئی یفیمچ آنکھوں کو پوری طرح کھولتے ہوئے خود سے سوال کرتا ہے۔ آخر اس سب سے حاصل کیا ہوا؟ مانع عفونت ادویات' کاخ اور پاستیر کوئی بنیادی تبدیلی نہیں پیدا کر سکے۔ اموات اور امراض کا سلسلہ پہلے ہی کی طرح آج بھی جاری ہے۔ تھیٹر پروگراموں اور ناچوں کا دماغی مریضوں کے لئے انتظام ضرور کیا جاتا ہے مگر وہ جہاں بند ہوتے ہیں وہاں سے رہا نہیں کئے جاتے۔ اس لئے یہ سب کچھ مہمل اور ہیچ ہے اور ویانا کے بہترین کلینک اور میرے اسپتال میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا۔

پھر بھی غم اور ایک جذبہ جو رشک سے ملتا جلتا ہے' اسے اس معاملے میں غیر جانبدار رہنے سے روک دیتے ہیں۔ مگر شاید یہ جذبہ تھکن سے نڈھال ہونے کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے بوجھل سر کو کتاب کے صفحے پر رکھ دیتا ہے اور کچھ آرام کے خیال سے ہاتھوں کو رخسار کے نیچے رکھ کر دوبارہ سوچنے لگتا ہے:

''میں ایک برے مقصد کی خدمت کر رہا ہوں' جنہیں فریب دیتا ہوں انہی سے

تنخواہ وصول کرتا ہوں۔ میں تو بے ایمان ہوں۔

لیکن میری وقعت ہی کیا ہے‘ میں تو ایک ضروری معاشرتی بدی میں بس ایک حقیر ذرہ ہوں۔ ضلعے کے سارے کے سارے افسران نکمے ہیں اور اس لئے اپنی بے ایمانی کے لئے قصوروار میں نہیں بلکہ یہ میرا یہ دَور ہے...... اگر میں دو سو برس بعد پیدا ہوا ہوتا تو بالکل مختلف فرد ہوتا۔“

گھڑی تین بجاتی ہے تو وہ لیمپ گل کر کے اپنی خواب گاہ کو چلا جاتا ہے۔ رہی نیند تو وہ اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہوتی ہے۔

دو سال قبل زیمستوو پر فیاضی کا دورہ پڑا‘ اس نے اسپتال کے طبی عملے میں اضافے کے سلسلے میں تین سو روبل سالانہ کی منظوری اس وقت تک کے لئے دے دی جب تک خود زیمستوو اپنا اسپتال نہ کھولے اور میونسپلٹی نے ضلع میڈیکل افسر یوگینی فیدورچ خوبوتوف کی خدمات حاصل کر لیں تاکہ وہ اندرئی یفیمچ کی مدد کر سکے۔ نیا ڈاکٹر نوجوان آدمی ہے۔ عمر تیس سے بھی کم ہی ہے۔ لمبا سا قد‘ سانولی رنگت‘ رخساروں کی ہڈیاں چوڑی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ دیکھنے میں روسی نژاد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ وہ قصبے میں بالکل خالی جیب‘ ایک چھوٹے سے صندوق اور ایک بدصورت سی نوجوان عورت کے ساتھ آیا جس کی گود میں بچہ تھا اور جسے اس نے اپنی باورچن بتایا۔ یوگینی فیروچ چھجے دار ٹوپی‘ لانگ بوٹ اور سردیوں میں بھیڑ کی کھال کا پوستین پہنتا ہے۔ طبی معاون سرگیئی سرگیچ اور خزانچی سے تو اس نے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد دوستی کر لی تھی لیکن اسپتال کے باقی افسروں کو جانے کیوں وہ طبقہ امراء کے ارکان کہتا اور ان سے دور ہی دور رہتا ہے۔ اس کے گھر میں صرف ایک کتاب ہے۔ ”ویانا کے کلینک کے تازہ ترین نسخے برائے 1881“ جسے ساتھ لئے بغیر کبھی بھی کسی مریض کو دیکھنے نہیں جاتا ہے۔ شاموں کو وہ کلب میں بلیئرڈ کھیلتا ہے لیکن تاش کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اسے ”یہ تو بڑا بے ڈھب معاملہ ہے!“ ”ارے آؤ بھئی‘ انسان تو بنا ہی تھا خوش ہونے کے لئے!“ اور

ایسے ہی دوسرے جملے اور فقرے استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے۔

وہ ہفتے میں دو بار اسپتال جاتا ہے جہاں جہاں مختلف وارڈوں میں گشت لگاتا اور باہری مریضوں کو دیکھتا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر سخت غصہ آتا ہے کہ مانع عفونت ادویات بالکل ہیں ہی نہیں اور خون نکالنے کے لئے پیالیوں جیسے گلاسوں کی افراط ہے لیکن وہ کوئی نیا طریقہ اس ڈر سے رائج نہیں کرتا کہ اندریئی یفیمچ کہیں برا نہ مان جائے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ساتھی اندریئی یفیمچ بے ایمان ہے' شک کرتا ہے کہ اس نے کافی دولت جمع کر رکھی ہو گی اور دل میں دل میں اس پر بھی رشک کرتا ہے۔ وہ اندریئی یفیمچ کو ہٹا کے بڑی خوشی کے ساتھ اس کی جگہ لینے کو تیار ہے۔

(۹)

بہار آ چکی تھی' مارچ کے آخری قیام تھے اور شام کا وقت۔ برف زمین سے غائب ہو چکی تھی' اسپتال کے احاطے میں مینائیں چہچہا رہی تھیں اور ایسے میں ڈاکٹر اپنے پوسٹ ماسٹر دوست کو رخصت کرنے کے لئے پھاٹک تک گیا۔ عین اسی وقت' یہودی موئے سینکما جو اپنی ایک عام گشت سے واپس آ رہا تھا' پھاٹک میں داخل ہوا۔ برہنہ سر' ننگے پیروں میں جوتوں کے اوپر پہننے کے صرف ربڑ کے جوتے اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا جس میں بھیک کے طور پر ملی ہوئی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

"ایک کوپیک دے دو نا!" اس نے سردی سے کانپتے ہوئے لیکن مسکراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر سے کہا۔

اندریئی یفیمچ نے جسے انکار کرنا آتا ہی نہ تھا' اسے دس کوپیک کا سکہ دے دیا۔

"کتنا تکلیف دہ ہے!" اس نے یہودی کی ننگی ٹانگوں اور ہڑیلے' کھردرے ٹخنوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "ایسے نم اور سرد موسم میں......"

وہ رحم اور کراہت کے ملے جلے جذبے کے تحت یہودی کے اس کے گنجے سر سے ٹخنوں تک جائزہ لیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے وارڈ نمبر کے پاس تک آ گیا۔ ڈاکٹر کے اندر قدم رکھتے ہی نکیتا کوڑے کباڑ کے ڈھیر سے اچھل کے اترا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"شام بخیر نیکیتا" اس نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا۔ "کیوں نہ اس یہودی کو لانگ بوٹ یا کچھ اور دے دیا جائے۔ اسے سردی لگ سکتی ہے۔"

"بہت اچھا' جناب عالی! میں سپرنٹنڈنٹ صاحب سے عرض کروں گا۔"

"ہاں ضرور! میرا نام لے لینا۔ کہنا کہ میں نے یہی کہا ہے۔"

گزرگاہ سے وارڈ کے اندر جانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایوان دمیترچ اپنے پلنگ پر کہنی کی ٹیک لگائے لیٹا ہوا غیر مانوس آواز کو بڑی تشویش کے ساتھ سن رہا تھا۔ دفعتاً اس نے ڈاکٹر کو پہچان لیا' غصے کے مارے تھر تھر کانپتا ہوا اچھل کے نیچے اترا اور دوڑ کے وارڈ کے وسط میں پہنچ گیا۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں جیسے باہر نکلی آ رہی تھیں۔

"ارے ڈاکٹر آ گیا!" وہ چلایا اور قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔ "آخرکار آ ہی گیا! میں آپ صاحبان کو مبارکباد دیتا ہوں' کتنی عنایت کی ڈاکٹر نے جو ہمیں دیکھنے آ گیا! لعنت ہو بدمعاش پر!" اس نے ایسی غضبناکی سے جو وارڈ میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی' فرش پر پاؤں پٹکتے ہوئے زوردار چیخ ماری۔ "مار ڈالو' کمبخت کو! نہیں نہیں! مار ڈالنا تو بہت ہی کم ہوگا! اسے پاخانے میں ڈال دو!"

اندریئی یفیمچ نے دروازے کے پاس پہنچ کر اندر جھانکتے ہوئے دھیرے سے پوچھا:

"کاہے کے لئے؟"

ایوان دمیترچ قہر آلود نگاہوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا اور اپنے کانپتے جسم پر لبادے کو سمیٹتے ہوئے چلایا: "کاہے کے لئے؟ چور کہیں کا!" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور ہونٹوں کو یوں سکوڑا جیسے تھوکنا چاہتا ہو۔ "عطائی! جلاد!"

"آپ مشتعل نہ ہوں' اندریئی یفیمچ نے معذرتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ زندگی میں چوری کبھی نہیں کی اور جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے تو شاید آپ بہت زیادہ مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ ذرا پرسکون ہونے کی کوشش کیجئے اور غصے گرمی کے بغیر

بتائیے' آخر اتنی برہمی کا سبب کیا ہے؟''

''اس لئے کہ آپ بیمار ہیں۔''

''جی ہاں! میں بیمار ہوں۔ لیکن سینکڑوں ہی پاگل آزاد پھر رہے ہیں جس کا سبب صرف یہ ہے کہ آپ اپنی جہالت کی بناء پر ان میں اور صحت مند انسانوں میں کوئی تمیز نہیں کر پا رہے ہیں۔ تو پھر آخر میں اور یہ بدبخت لوگ دوسروں کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے قربانی کے دوسرے بہت سے بکروں کی طرح یہاں کیوں قید رہیں؟ خود آپ' آپ کا نائب' آپ کا انسپکٹر...... اسپتال کی کمینوں کی یہ ٹولی ہم میں سے کسی کے بھی مقابلے میں اخلاقی طور پر انتہائی پست ہے۔ تو پھر آخر یہاں ہم کیوں ہیں' آپ کیوں نہیں؟ بھلا یہ کہاں کی معقولیت ہے؟''

''اخلاقی اقدار اور معقولیت کا اس معاملے سے ذرا بھی تعلق نہیں۔ ہر شے کا انحصار محض اتفاق پر ہے۔ جو لوگ یہاں لائے جاتے ہیں' یہاں رہتے ہیں اور جو نہیں لائے جاتے وہ اپنی آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ہے سارا قصہ۔ اس حقیقت میں کہ آپ دماغی مریض ہیں اور میں ڈاکٹر' نہ اخلاقیات کا ہاتھ ہے نہ معقولیت کا' اتفاق کے سوا اور کسی شے کا بھی ہاتھ نہیں۔''

''اس طرح کی بکواس میری سمجھ میں نہیں آتی......'' ایوان دمیترچ نے اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کھوکھلی آواز میں کہا۔

موئے سیئکا نے جس کی ڈاکٹر کی موجودگی میں تلاشی لینے کی نیکیتا کو ہمت نہیں پڑی تھی' اپنے روٹی کے ٹکڑے' کاغذ کے ٹکڑے اور ہڈیاں اپنے پلنگ پر پھیلا دیں اور اب بھی سردی سے کپکپاتے ہوئے یہودیوں کی زبان میں گانے جیسے انداز سے خود کلامی شروع کر دی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوکان کھول دی ہے۔

''مجھے یہاں سے چلے جانے دیجئے!'' ایوان دمیترچ نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

''یہ تو میں نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر کیوں؟''

''کیونکہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ اپنے آپ سے پوچھئے کہ میں آپ کو چھوڑ دوں تو فائدہ کیا ہوگا؟ فرض کیجئے کہ میں آپ کو جانے دیتا ہوں تب بھی تو قصبے کے لوگ اور پولیس والے پکڑ کے یہیں واپس لے آئیں گے۔''

''ہاں ہاں! یہ سچ ہے......'' ایوان دمیترچ نے ماتھا سہلاتے ہوئے کہا۔ ''عجیب بھیانک چکر ہے! تو پھر کیا کروں؟ بتایئے نا' کیا کروں؟''

اس کی آواز اور نوجوانوں جیسے چہرے نے جس سے اس کے منہ بنانے کے باوجود ذہانت ٹپکتی تھی' اندریئی یفیمچ کو متاثر کر دیا۔ وہ اس نوجوان سے تسلی کے دو لفظ کہنے اور اس کی پریشانی کم کرنے کے لئے بے چین ہوا تھا۔ آخر اس نے ایوان دمیترچ کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر چند لمحوں تک غور کرنے کے بعد کہا:

''آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے؟ بہترین صورت تو بس یہی ہو گی کہ آپ یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن افسوس کہ اس سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں۔ آپ کو پکڑ لیا جائے گا۔ جب معاشرہ مجرموں' دماغی مریضوں اور پریشان کرنے والے دوسرے افراد سے خود کو محفوظ رکھنے کا تہیہ کر لیتا ہے تو پھر اسے ایسا کرنے سے کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی۔ اب آپ کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ جاتا ہے: خود کو اس حقیقت سے ہم آہنگ کر لیجئے کہ یہاں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔''

''چونکہ قید خانوں اور پاگل خانوں جیسی جگہیں موجود ہیں' اس لئے ایسے افراد بھی درکار ہیں جو انہیں بھر سکیں۔ آپ نہ ہوں گے تو میں ہوں گا' میں نہ ہوں گا تو کوئی اور ہو گا۔ انتظار کیجئے' مستقبل بعید میں جب نہ قید خانے ہوں گے نہ پاگل خانے تو آہنی سلاخ دار کھڑکیوں اور اسپتالی لبادوں کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ وہ زمانہ دیر سویر آ کر ہی رہے گا۔''

ایوان دمیترچ کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

''آپ تو مذاق پہ اتر آئے'' اس نے اپنی آنکھوں کو ذرا بھینچتے ہوئے کہا۔ ''خود

آپ اور آپ کے اس معاون نیکیتا جیسے صاحبان کے لئے مستقبل کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن یقین کیجئے' جناب والا کہ بہتر زمانہ آئے گا ضرور! میرے خیالات ہوسکتا ہے کہ دقیانوسی ہوں' ہوسکتا ہے کہ آپ کو ہنسی آجائے لیکن نئی زندگی کی صبح اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو گی' سچائی کا بول بالا ہو گا۔ اور ہم بھی اُجالے کو دیکھیں گے! میں تو اسے نہ دیکھ سکوں گا' اس وقت تک دنیا سے کوچ کر چکا ہوں گا مگر دوسروں کے پڑپوتے اسے دیکھیں گے۔ میں ان سب کا خلوصِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ ان کے دن پھر جائیں گے! آگے بڑھیئے! خدا آپ کا حامی و ناصر ہوں' دوستو!''

ایوان دمیترچ نے جس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اٹھ کر کھڑکی کی طرف اپنے بازو پھیلا دیئے اور ہیجانی لہجے میں اپنی بات جاری رکھی:

'' ان سلاخوں کے پیچھے میں آپ کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کر رہا ہوں! سچائی زندہ باد! میں خوشی منا رہا ہوں!''

'' مجھے تو خوشی منانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا'' اندریئی یفیمچ نے کہا جسے ایوان دمیترچ کی یہ بے پایاں مسرت قدرے تصنع آمیز معلوم ہوئی' پھر بھی اس کے لئے اس نے مریض کو پسند ہی کیا۔'' قید خانے اور پاگل خانے تو یقیناً نہ ہوں گے اور سچائی کا جیسا کہ آپ کو کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے' بول بالا ہو گا لیکن کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو گی' قوانین قدرت بالکل ایسے ہی رہیں گے۔ لوگ آج ہی کی طرح کل بھی بیمار پڑیں گے' بوڑھے ہوں گے اور دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ طلوعِ سحر آپ کی زندگی کو کتنی ہی آب و تاب کے ساتھ منور کیوں نہ کرے' انجام یہی ہو گا کہ آپ تابوت میں بند کر کے زمین کے تنگ و گڑھے میں ڈال دیئے جائیں گے۔''

'' اور حیاتِ ابدی کے متعلق کیا خیال ہے؟''

'' محض بکواس!''

'' آپ اس میں یقین نہیں رکھتے لیکن میں تو رکھتا ہوں۔ دوستوفیسکی یا شاید والٹیر کے کسی کردار نے کہا تھا کہ خدا نہ ہوتا تو انسانوں نے اسے ایجاد کر لیا ہوتا۔ اور مجھے کامل

یقین ہے کہ اگر حیاتِ ابدی جیسی کسی شے کا وجود نہیں ہے تو عظیم انسانی ذہن دیر سویر اسے ایجاد کر لے گا۔"

"کیا خوب کہا!" اندریئی یفیمچ خوش ہو کے مسکراتے ہوئے پکار اٹھا۔ "کتنی اچھی بات ہے کہ آپ اعتقاد رکھتے ہیں۔ آپ کے جیسے اعتقاد والا آدمی قید خانے میں بھی خوش رہ سکتا ہے۔ کیا آپ نے کہیں تعلیم حاصل کرنے کی بھی زحمت کی تھی؟"

"جی ہاں! میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا لیکن تعلیم مکمل نہ کر سکا۔"

"آپ غور و فکر کرنے والے انسان ہیں۔ آپ تو کیسے بھی کٹھن حالات میں کیوں نہ ہوں، اپنے افکار و خیالات کی دنیا میں سکون اور اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی کے مکمل ادراک کے لئے آزاد اور گہری فکر اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کی احمقانہ دوڑ دھوپ سے شدید نفرت...... یہ ایسی نعمتیں ہیں جن سے بہتر ابھی تک کبھی بھی انسان کو میسر نہیں ہوئیں۔ اور آپ دنیا کی تمام سلاخ دار کھڑکیوں کے باوجود ان نعمتوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈیوگیس لکڑی کے پیپے میں رہتا تھا مگر بادشاہوں سے زیادہ خوش و خرم۔"

"آپ کا ڈیوگیس گدھا تھا" ایوان دمیترچ نے بیزاری سے کہا۔ "یہ آپ ڈیوگیس اور کسی نہ کسی شے کے ادراک کے بارے میں مجھ سے کیوں باتیں کر رہے ہیں؟" اس نے دفعتاً چراغ پا ہو کر تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں زندگی سے محبت کرتا ہوں، شدید محبت! میں مسلسل اذیت دیئے جانے کے خبط کا شکار ہوں، پریشان کن خوف مجھے مسلسل تڑپاتے رہتے ہیں لیکن ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب زندگی کی تڑپ مجھے مغلوب کر دیتی ہے اور تب ڈر لگتا ہے کہ کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ میں جینے کی آرزو رکھتا ہوں، کتنی شدید آرزو!"

اس نے اپنی ہیجانی حالت میں کمرے کو پار کیا اور آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا:

"کبھی کبھی مجھے خوابوں میں بھوت نظر آتے ہیں۔ لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں، لوگوں کی آوازیں اور موسیقی میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی جنگل میں یا ساحل سمندر پر کھڑا ہوا ہوں اور میں زندگی کی چہل پہل

کے لئے، فکروں کے لئے بے تاب ہو اٹھتا ہوں...... مجھے بتایئے نا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اچانک اس نے پوچھا۔ ''باہری دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟''

''آپ ہمارے قصبے کے متعلق جاننا چاہتے ہیں یا عام دنیا کے متعلق؟''

''پہلے قصبے کے متعلق بتایئے پھر دنیا کے عام حالات۔''

''بہت خوب۔ قصبے کے شب و روز دبال جان ہیں...... ایک بھی شخص تو ایسا نہیں جس سے باتیں کرنے یا جس کی باتیں سننے کو جی چاہے۔ نئی صورتیں تک نظر نہیں آتیں۔ ویسے ایک نوجوان ڈاکٹر خوبوتوف البتہ ابھی حال میں آئے ہیں۔''

''ہاں! وہ میرے سامنے ہی آیا تھا۔ گنوار ہے نا؟''

''ہاں! کوئی خاص مہذب آدمی نہیں ہیں۔ عجب مضحکہ خیز صورت حال ہے...... جو کچھ سننے میں آتا ہے اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مرکزی علاقے جمود کا شکار نہیں ہیں، دانش ورانہ سرگرمیاں جاری ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں کھرے افراد ضرور ہوں گے مگر وہ لوگ جنہیں ہمارے ہاں بھیجتے ہیں وہ بس کھوٹے ہی سے ہوتے ہیں۔ بد بخت قصبہ!''

''واقعی بد بخت!'' ایوان دمیترچ نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہنس پڑا۔ ''اور دنیا کا کیا حال ہے؟ اخباروں رسالوں میں کیا کیا چھپ رہا ہے؟''

وارڈ میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ڈاکٹر اٹھا اور اس نے کھڑے کھڑے روسی اور غیر ملکی اخباروں کی خبریں اور جدید فکر کے رجحانات سے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ ایوان دمیترچ نے بیچ بیچ میں ایک آدھ سوال پوچھتے ہوئے یہ سب کچھ بڑے غور سے سنا اور پھر اچانک جیسے کوئی بھیانک بات یاد آ گئی ہو، دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما اور ڈاکٹر کی طرف پیٹھ کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔

''کیا کچھ طبیعت خراب ہو گئی؟'' اندرئی یفیمچ نے پوچھا۔

''اب آپ مجھ سے ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکیں گے!'' ایوان دمیترچ نے درشتی سے کہا۔ ''مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے!''

''کیوں' کیا بات ہے؟''

''میں کہہ رہا ہوں' مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے! کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟''

اندرئی یفیمچ نے شانے اچکاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری اور وارڈ سے چلا آیا۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے گزرگاہ میں کہا:

''ارے نیکیتا' بہتر ہوگا کہ یہاں کچھ صفائی کر دی جائے''۔ ''کیسی بدبو پھیلی ہوئی ہے!''

''بہت اچھا' جناب عالی!''

''اچھا نوجوان ہے'' اندرئی یفیمچ نے گھر جاتے وقت راستے میں سوچا۔ ''اتنے برسوں کے بعد یہ پہلا شخص ملا ہے جس سے میں باتیں کر سکتا ہوں۔ بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور اسے صرف انہی چیزوں سے دلچسپی ہے جو قابل توجہ ہیں۔''

اس روز رات کو مطالعے کے دوران اور بعد میں بستر پر بھی وہ ایوان دمیترچ ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور اگلی صبح کو بیدار ہونے پر اسے یاد آیا کہ ایک ذہین اور دلچسپ شخص سے اس کی شناسائی ہوگئی ہے اور اس نے موقع پاتے ہی اس سے ملاقات کے لئے دوبارہ جانے کا فیصلہ کیا۔

(۱۰)

ایوان دمیترچ اپنے پلنگ پر گزشتہ شام جیسی حالت میں کنپٹیوں کو ہاتھوں سے جکڑے گھٹنے سکوڑے لیٹا ہوا تھا۔ منہ دیوار کی طرف تھا۔

''کہئے! کیا حال ہے' میرے دوست؟'' اندرئی یفیمچ نے کہا۔ ''آپ سو تو نہیں رہے ہیں؟''

''اول تو میں آپ کا دوست نہیں ہوں'' ایوان دمیترچ تکیے سے منہ ہٹائے بغیر بڑبڑایا'' اور دوسرے یہ کہ خود کو ہلکان نہ کیجئے' آپ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ اگلوا سکیں گے۔''

"عجب بات ہے......" اندریئی یفیمچ نے کچھ خجل ہو کر کہا۔ "کل ہم دونوں کتنی عمدہ باتیں کر رہے تھے مگر آپ نے اچانک برا مان کر گفتگو ختم کر دی...... یا تو میں نے اپنے خیالات کا اظہار بھونڈے پن سے کیا ہوگا یا پھر میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہوگی جو آپ کے یقین کامل کے منافی تھی......"

"آپ کے خیال میں اس بہانے کو میں سچ مان لوں گا؟" ایوان دمیترچ نے بیٹھ کر ڈاکٹر کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' جو بیک وقت مذاق بھی اڑا رہی تھیں اور تشویش کی بھی آئینہ دار تھیں۔ اس کے پپوٹے سرخ ہو رہے تھے۔ "بہتر ہوگا کہ اپنی یہ جاسوسی اور پوچھ گچھ کہیں اور جا کے کیجئے' مجھ سے کچھ ملنے ملانے کا نہیں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ کل آپ یہاں کیوں آئے تھے۔"

"عجب بات ہے!" ڈاکٹر دھیرے سے ہنس پڑا۔ "تو آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی مخبر ہوں؟"

"جی ہاں! بالکل...... یا تو مخبر ہیں یا ایسے ڈاکٹر جسے مجھ پر نگاہ رکھنے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ دونوں میں کوئی فرق تھوڑی ہے۔"

"آپ' معاف کیجئے گا...... آپ عجیب و غریب شخص ہیں!"

ڈاکٹر نے پلنگ کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ کر سرزنش کے انداز میں سر ہلایا۔

"اچھی بات ہے' فرض کئے لیتے ہیں کہ آپ کا خیال درست ہے" اس نے کہنا شروع کیا' "فرض کئے لیتے ہیں کہ میں جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں' آپ سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ پولیس پر آپ کے راز منکشف کر دوں۔ آپ گرفتار کر لئے جائیں گے' مقدمہ چلے گا۔ لیکن کیا آپ سوچتے ہیں کہ عدالت یا قید خانہ آپ کے لئے بدتر ثابت ہوگا؟ اور اگر آپ جلاوطن کر دیئے جائیں یا قید بامشقت کی سزا ملے تو کیا آپ کے خیال میں وہاں کا ماحول اس وارڈ کے ماحول سے بھی زیادہ خراب ہوگا؟ مجھے تو اس کا یقین نہیں...... تو پھر آپ کو ڈر کاہے کا؟"

ان الفاظ نے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ایوان دمیترچ کو متاثر کیا اور وہ کچھ پرسکون

نظر آنے لگا۔

ذرا دیر قبل ہی چار بجے تھے اور یہ وہ وقت تھا جب اندریئی یفیمچ عموماً اپنے کمروں میں ٹہلا کرتا تھا اور داریا اس سے پوچھتی تھی کہ کیا وہ بیئر پینا پسند کرے گا۔ ہوائیں ٹھہری ہوئی تھیں اور شام کی فضا منور۔

"میں کھانے کے بعد ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں خیال آیا کیوں نہ چل کے آپ سے ملاقات کرآؤں" ڈاکٹر نے کہا۔ "صحیح معنوں میں موسم بہار کا دن ہے۔"

"یہ کون سا مہینہ ہے؟ مارچ؟"

"جی ہاں! مارچ کے آخری ایام۔"

"باہر بہت کیچڑ ہے کیا؟"

"بہت تو نہیں ہے۔ باغ کے راستے خشک ہو چکے ہیں۔"

"ایسے دن میں تو کتنا اچھا لگے گا اگر بگھی پر سوار ہو کر قصبے کے باہر سیر کروں" ایوان دمیترچ نے اپنے سرخ حلقوں کی آنکھوں کو یوں ملتے ہوئے کہا جیسے ابھی ابھی گہری نیند سے بیدار ہوا ہو" اور گھر کے گرم اور آرام دہ مطالعے کے کمرے کو واپس لوٹوں...... میں تو بھول ہی چکا ہوں کہ انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا کس کو کہتے ہیں۔ یہ بڑی غلیظ جگہ ہے! ناقابل برداشت حد تک غلیظ!"

وہ گزشتہ روز کے ہیجان سے کمزور اور نڈھال ہو رہا تھا اور الفاظ بڑی بے دلی کے ساتھ اس کے منہ سے نکلتے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور چہرہ سر کے شدید درد کی گواہی دے رہا تھا۔

"مطالعے کے گرم اور آرام دہ کمرے اور اس وارڈ میں کوئی فرق تھوڑی ہے" اندریئی یفیمچ نے کہا۔ "انسانوں کو سکون اور اطمینان کی تلاش باہری دنیا میں نہیں بلکہ اپنی باطنی دنیا میں کرنی چاہیے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"معمولی آدمی نیکی یا بدی کو باہری چیزوں مثلاً بگھی یا مطالعے کے کمرے میں

تلاش کرتا ہے جبکہ سوچ بچار کرنے والا آدمی خود اپنی ذات کے اندر۔"

"اپنے اس فلسفے کی تبلیغ جا کے یونان میں کیجئے جہاں ہمیشہ گرمی پڑتی ہے اور فضا میں سنترے کے پھولوں کی مہک بسی رہتی ہے۔ اس قسم کی بات ہماری آب و ہوا میں موزوں نہیں ہے۔ ڈیوگیس کے متعلق میں نے کس سے باتیں کی تھیں؟ آپ سے؟"

"جی ہاں! کل۔"

"ڈیوگیس کو مطالعے کے یا کسی بھی گرم کمرے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہاں ویسے ہی گرمی پڑتی تھی۔ وہ اپنے پیپے میں پڑا جھولتا اور زیتون کے پھل اور سنترے کھا تا رہ سکتا تھا۔ اگر وہ روس میں رہتا ہوتا تو دسمبر تو جانے دیجئے مئی کے مہینے میں ہی کسی سے خوشامد کرتا کہ بھائی اپنے گھر میں جگہ دے دو۔ سردی کے مارے بیچارے کا سارا جسم ٹھٹھرنے لگتا۔"

"ہرگز نہیں! سردی کو بھی کسی دوسرے درد کی طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مارکوس آوریلیس نے کہا تھا: "درد دراصل درد کا زوردار تصور ہی ہوتا ہے۔ آپ اپنی قوتِ ارادی سے اس تصور کو بدل سکتے ہیں۔ اسے بھلا دیجئے' تکلیف کی شکایت کرنا بند کر دیجئے اور درد ختم ہو جائے گا۔" اور اس کا خیال درست تھا۔ کوئی عاقل یا صرف غور و خوض کا عادی شخص بھی پہچانا ہی اپنے اسی وصف سے جاتا ہے کہ وہ تکلیف کو خاک بھی خاطر نہیں لاتا۔ وہ تو ہمیشہ مطمئن رہتا ہے' کوئی شے اسے متحیر نہیں کر سکتی۔"

"تب تو ضرور میں احمق ہوں کیونکہ میں تکالیف محسوس کرتا ہوں' غیر مطمئن رہتا ہوں اور انسانی کمینگی پر مسلسل محو حیرت۔"

"یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر آپ بار بار معاملات کی تہہ تک جانے کی کوشش کریں تو دیکھیں گے کہ ہمیں ہیجان میں مبتلا کرنے والی خارجی چیزیں دراصل کتنی حقیر ہوتی ہیں۔ آپ کو تو زندگی کے ادراک کی جدوجہد کرنی چاہیے جو واحد نعمت ہے۔"

"ادراک......" ایوان دمیترچ نے کانپتے ہوئے کہا۔ "خارجی' داخلی......معاف کیجئے گا' اس قسم کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں" اس نے

کھڑے ہو کر ڈاکٹر کو برہمی سے دیکھتے ہوئے کہا "کہ خدا نے مجھے گرم لہو اور اعصاب کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ جی ہاں! جناب! نامیاتی سچ میں اگر کوئی حیاتی صلاحیت ہے تو اسے ہیجانات پر ردعمل ظاہر کرنا چاہئے۔ اور مجھ پر یقیناً ردعمل ہوتا ہے! میں درد پر نالہ و فریاد کے ذریعے، کمینگی پر شدید غصے کے ذریعے اور بدمعاشی پر نفرت کے ذریعے ردعمل ظاہر کرتا ہوں۔ اور میرے خیال میں اسی کا نام ہے زندگی! کوئی جاندار جتنی پست سطح کا ہوتا ہے اتنی ہی اس کی حس اور ہیجانات پر اس کے ردعمل کمزور ہوتے ہیں اور جتنی بلند سطح کا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ حقیقت کے سلسلے میں اس کا ردعمل حساس اور تند و تیز ہوتا ہے۔ آخر آپ کو اتنی سی بات بھی کیوں نہیں معلوم؟ ڈاکٹر ہو کر ایسی ابتدائی باتوں سے بھی بے خبری! کسی شخص کے تکالیف کو حقیر سمجھنے، ہمیشہ مطمئن رہنے اور کبھی متحیر نہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حالت کو پہنچ چکا ہو" اور ایوان دمیترچ نے یہ کہتے ہوئے موٹے کسان کی طرف اشارہ کیا" "یا پھر یہ کہ تکالیف نے اسے پتھر بنا دیا ہو، بالکل بے حس کر دیا ہو یعنی یہ کہ وہ جی ہی نہ رہا ہو۔ معاف کیجئے گا" اس نے جھلاہٹ کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی، "نہ میں عاقل ہوں نہ فلسفی، ان معاملات میں بالکل کورا ہوں۔ میں دلائل پیش کرنے کی حالت میں نہیں ہوں۔"

"لیکن آپ بڑے سلیقے سے دلائل پیش کرتے ہیں۔"

"رواقیت پسند جن کی تعلیمات کو آپ مضحکہ بنا کر پیش کر رہے ہیں، بلاشک خاصے ممتاز افراد تھے لیکن ان کا فلسفہ ان دو ہزار برسوں میں بالکل جامد و ساکت رہا ہے، دو قدم بھی آگے نہیں بڑھا اور بڑھ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ ناقابل عمل اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ تھوڑے سے افراد میں جو اپنی زندگیاں مطالعے اور مختلف تعلیمات سے محظوظ ہونے میں صرف کیا کرتے تھے، ضرور مقبول تھے لیکن اکثریت اسے کبھی بھی سمجھ نہ سکی۔ کوئی فلسفہ جو دولت و آسائش سے بے اعتنائی اور تکالیف اور موت کو حقیر سمجھنے کی تعلیم دیتا ہو، اکثریت کے لئے قطعاً ناقابل فہم ہوتا ہے کیونکہ اکثریت کو نہ کبھی دولت میسر ہوتی ہے نہ آسائشیں۔ ان لوگوں کے لئے تو تکالیف کو حقیر سمجھنا خود زندگی کو حقیر سمجھنے کے

مترادف ہوگا کیونکہ انسان کا سارا وجود ہی بھوک، سردی، ذلت، نقصان اور موت کے ایسے خوف پر جیسا کہ ہیملٹ پر طاری تھا، مشتمل ہوتا ہے۔ زندگی وبال جان اور گھناؤنی ہو سکتی ہے لیکن کبھی کسی نے زندگی سے نفرت نہیں کی۔ اس لئے میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ رواقیت پسندوں کی تعلیمات کا کوئی مستقبل نہیں اور عہد عتیق سے دور حاضر تک جن چیزوں میں ارتقائی کیفیت دیکھی گئی ہے وہ صرف یہ ہیں: جدوجہد کرنے کی قوت، درد وغم کا احساس اور ہیجانات پر ردعمل کی صلاحیت......"

ایوان دمیترچ دفعتاً اپنے استدلال کی کڑی کے کھو جانے سے خاموش ہو کر پریشانی سے ماتھا سہلانے لگا۔

"میں کوئی بڑی اہم بات کہنے جا رہا تھا پر ذہن سے نکل گئی" اس نے کہا۔ "میں کاہے کے بارے میں بات کر رہا تھا؟ ارے ہاں! میں یہ کہنا چاہتا تھا: ایک رواقیت پسند نے اپنے دوست کو آزاد کرانے کے لئے خود کو فروخت کر دیا اور غلام بن گیا۔ تو آپ نے دیکھا نا کہ اس رواقیت پسند نے ہیجان پیدا کرنے والی ایک بات پر ردعمل ظاہر کیا کیونکہ کسی دوسرے کے لئے خود اپنی ہستی کو مٹا دینے جیسا فیاضانہ کارنامہ انجام دینے کے لئے انسان کے سینے میں دردمند دل کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ کبھی مجھے جو کچھ آتا تھا سب کچھ اس قید خانے میں گنوا بیٹھا ورنہ دوسری مثالیں بھی دے دیتا۔ جی چاہے تو حضرت عیسیٰ ہی کی مثال لے لیجئے۔ وہ حقائق پر اپنے ردعمل کا اظہار رو کر، مسکرا کر، سوگ منا کر، آپے سے باہر ہو کر اور غم زدہ ہو کو کیا کرتے تھے۔ وہ تکالیف پر مسکراتے نہیں تھے، موت سے نفرت نہیں کرتے تھے بلکہ گستمنی باغ میں بیٹھے بیٹھے دعائیں مانگتے تھے کہ مصائب دور ہو جائیں۔" یہ کہہ کر ایوان دمیترچ ہنس پڑا اور بیٹھ گیا۔

"اچھا فرض کئے لیتے ہیں کہ انسان کو سکون اور اطمینان اپنے وجود کے باہر نہیں بلکہ اندر تلاش کرنا چاہئے" اس نے کہا۔ "فرض کئے لیتے ہیں کہ تکالیف سے نفرت کرنا اور کسی بات پر متحیر نہ ہونا درست ہے۔ لیکن اس نظریے کی تبلیغ کا آپ کو کیا حق

ہے؟ آپ عاقل ہیں کیا، فلسفی ہیں کیا؟''

''نہیں! میں فلسفی تو نہیں ہوں لیکن اس نظریے کی تبلیغ ہر شخص کو کرنی چاہئے کیونکہ یہ معقول ہے۔''

''اوہ! لیکن میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر آپ خود کو ادراک' تکالیف سے نفرت اور ایسی ہی دوسری باتوں کا استاد کیسے تصور کرتے ہیں؟ کبھی تکلیف جھیلی بھی ہے؟ وہم و گمان میں بھی ہے کہ تکلیف کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ پوچھنے کے لئے معافی چاہتا ہوں کہ کبھی بچپن میں کوڑے بھی کھائے ہیں؟''

''نہیں! میرے والدین جسمانی سزا کے مخالف تھے۔''

''اور میرے والد بڑی بے رحمی سے مجھ پر کوڑے برسایا کرتے تھے۔ وہ ایک افسر تھے۔ غصے میں بالکل بھوت ہو جایا کرتے تھے' لمبی سی ناک تھی' پیلی پیلی گردن اور بواسیر کا مرض۔ خیر ان کا ذکر جانے دیجئے' بات تو آپ کی ہو رہی تھی۔ مارنا تو دور کی بات' زندگی بھر آپ کو کسی نے انگلی تک نہیں لگائی' کسی نے ڈرایا دھمکایا نہیں' ظلم جبر نہیں کیا۔ طاقت کا یہ حال ہے کہ بالکل پہلوان ہو رہے ہیں۔ اپنے والد کے سائے میں پلے بڑھے' ان کے پیسوں سے تعلیم حاصل کی اور پھر برائے نام کام والی نوکری مل گئی۔ بیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے کہ آپ ایک گرم اور منور گھر میں مفت ٹھاٹھ کر رہے ہیں' نوکرانی رکھ چھوڑی ہے اور پورا حق حاصل ہے کہ آپ کا جی جب چاہے تب کام کریں اور نہ چاہے تو بالکل نہ کریں۔ مزاجاً آپ کاہل اور مجہول ہیں اس لئے زندگی کو کچھ ایسے ڈھرے پر لگا لیا ہے کہ کسی قسم کی پریشانی یا غیر ضروری دوڑ دھوپ سے سابقہ ہی نہ پڑے۔ اپنی ساری ذمے داریاں اپنے نائب اور دوسرے بدمعاشوں کے سپرد کر دی ہیں اور خود گھر کے پرسکون اور گرم ماحول سے لطف اندوز ہو رہے ہیں' پیسے بچا رہے ہیں' مطالعہ کر رہے ہیں' بھانت بھانت کے اعلا و ارفع بکواس سے ذہن کی ضیافت کا سامان فراہم کر رہے ہیں اور (ایوان دمیترچ نے تیزی سے ڈاکٹر کی سرخ ناک پر نظر ڈالی) مے نوشی کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ نے زندگی کو نہ دیکھا ہے نہ اس کے متعلق

کچھ جانتے ہیں اور حقیقت کے بارے میں آپ کی ساری معلومات بس نظریاتی ہی ہیں۔ آپ تکالیف کو حقیر تصور کرتے ہیں، کسی بات پر متحیر نہیں ہوتے تو اس کا سبب بہت آسان سا ہے: آپ کا یہ سارا کھوکھلا پن، زندگی، تکالیف اور موت سے خارجی اور داخلی نفرت، ادراک، حقیقی نعمتیں۔ یہ سارا فلسفہ کسی دوسرے فلسفے کی بہ نسبت روسی کاہل کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی کسان اپنی بیوی کو زدوکوب کر رہا ہے۔ مداخلت کی کیا ضرورت؟ مارتا ہے تو مارنے دیجئے، دیر سویر ان دونوں ہی کو دنیا سے اٹھ جانا ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنی اس حرکت سے خود اپنا ہی اخلاق بگاڑ رہا ہے، بیوی کا تھوڑی۔ شراب کی لت بے شک احمقانہ اور ناشائستہ ہے لیکن پینے والے اور نہ پینے والے مرتے تو دونوں ہی ہیں۔ کوئی عورت آپ کے پاس دانت کے درد کی شکایت لے کر آتی ہے...... اچھا، درد ہو رہا ہے تو کیا ہوا؟ درد ہے کیا، محض درد کا تصور، اور پھر ہم یہ توقع تو نہیں کر سکتے کہ زندگی میں کبھی بیمار ہی نہ پڑیں گے، مرنا تو ہم سبھی کو ہے اس لئے اے عورت! جا اپنی راہ لے اور مجھے سکون کے ساتھ سوچنے اور مے نوشی کرنے دے۔ کوئی نوجوان آپ کے پاس مشورے کے لئے آتا ہے، جاننا چاہتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے، زندگی کیسے گزارنی چاہئے۔ کوئی دوسرا شخص محض جواب دینے سے قبل ذرا دیر غور کرے گا لیکن آپکا جواب تیار رہتا ہے: ادراک کی کوشش کرو یا جیسا کہ آپ اس بات کو کہتے ہیں، حقیقی نعمت کے حصول کی۔ لیکن آخر یہ پراسرار ''حقیقی نعمت'' ہے کیا؟ ظاہر ہے کہ اس کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ہم ان آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں، مارے پیٹے جاتے ہیں، پڑے پڑے گل سڑ رہے ہیں مگر یہ سب بہت ہی شاندار اور معقول ہے کیونکہ اس وارڈ اور مطالعے کے گرم کمرے میں کوئی فرق نہیں۔ واقعی بڑے کام کا ہے یہ پاک و صاف ہے اور آپ خود کو صحیح معنوں میں عاقل و فرزانہ تصور کرتے ہیں...... نہیں! جناب عالی! یہ قطعاً کوئی فلسفہ نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی وسیع الخیالی نہیں۔ یہ تو بس کاہلی ہے، تقدیر پرستی ہے، ذہنی بے حسی ہے...... جی ہاں! واقعی!'' ایوان دمیترچ ایک بار پھر بڑی تندی و تیزی سے چلایا۔ ''آپ تکالیف کو حقارت

کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن اگر آپ کی چھنگلیا دروازے میں دب جائے تو شاید آپ پوری قوت سے چیخ اٹھیں!''

''اور شاید نہ چیخوں'' اندریئی یفیمچ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ نہ چیخیں گے! اگر اچانک آپ پر فالج گر پڑے یا کوئی بے وقوف یا کوئی لچا بدمعاش اپنے عہدے اور معاشرتی مرتبے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر سب کے سامنے آپ کی پگڑی اچھالے اور آپ جانتے ہوں کہ وہ سزا سے بچ جائے گا تب آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ لوگوں کو ادراک اور حقیقی نعمتوں کے لئے کوشاں ہونے کا مشورہ دینا کیا معنی رکھتا ہے۔''

''بڑی جدت ہے آپ کے اس خیال میں'' اندریئی یفیمچ نے ہاتھوں کو ملتے اور خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔'' میں آپ کی تعمیم کرنے سے متعلق رجحان پر عش عش کرتا ہوں اور ابھی ابھی آپ نے میرے کردار کا جس ذہانت کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے اس کا کیا کہنا! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے باتیں کرنا سب سے بڑی مسرت ہے۔ خیر! میں آپ کی سن چکا' اب ازرہ نوازش میری سنئے......''

ان دونوں کی گفتگو کوئی گھنٹے بھر تک جاری رہی اور اس نے اندریئی یفیمچ کو یقیناً بہت زیادہ متاثر کیا کیونکہ اب ہر روز وہ وارڈ نمبر 6 کے چکر لگانے لگا۔ کبھی وہ صبح کو جاتا' کبھی لنچ کے بعد اور اکثر ایوان دمیترچ سے اس کی گفتگو اتنا طول کھینچتی کہ اندھیرا ہو جاتا۔ پہلے تو ایوان دمیترچ اپنے اور اس کے درمیان ایک طرح کی دیوار سی حائل رکھتا' شک کرتا کہ اس کے دل میں کچھ کھوٹ ہے اور کھلم کھلا کہتا رہتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے مگر جلد ہی وہ اندریئی یفیمچ کی صحبت کا عادی ہو گیا اور اپنے سخت لہجے کو نرم طنزیہ لہجے میں بدل دیا۔

جلد ہی سارے اسپتال میں افواہ پھیل گئی کہ ڈاکٹر اندریئی یفیمچ پابندی کے ساتھ وارڈ 6 میں جانے لگا ہے۔ اس کے نائب نیکیتا اور نرسوں میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ وہ آخر اس وارڈ میں کیوں جاتا ہے وہاں گھنٹوں کیا کرتا ہے' موضوع گفتگو کیا ہوتا ہے اور کبھی نسخہ کیوں نہیں لکھتا۔ اس کا طرز عمل کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ میخائل آویریانچ جب اس سے ملنے آتا تھا تو اکثر وہ گھر سے باہر ہوتا تھا اور داریا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ ڈاکٹر اب نہ صرف یہ کہ پابندی کے ساتھ بیئر نہیں پیتا تھا بلکہ بعض اوقات دن کے کھانے میں بھی تاخیر کر دیتا تھا۔

جون کے آخری دنوں میں ایک بار ڈاکٹر خوبوتوف کسی کام سے اندریئی یفیمچ کے ہاں گیا۔ وہ گھر میں نہ ملا تو خوبوتوف اسے تلاش کرنے کے لئے احاطے میں نکلا جہاں اسے بتایا گیا کہ معمر ڈاکٹر دماغی امراض کے وارڈ میں ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ گزرگاہ میں ٹھہر گیا اور کھڑے کھڑے مندرجہ ذیل بات چیت سنی۔

"ہم کبھی بھی متفق نہ ہوں گے اور آپ کبھی بھی مجھے اپنا ہم خیال نہ بنا سکیں گے" ایوان دمیترچ چڑے چڑے پن کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "آپ کو معلوم ہی نہیں کہ حقیقت کیا ہوتی ہے' آپ نے کبھی بھی تکالیف نہیں برداشت کیں اور کسی جونک کی طرح دوسروں کا خون چوس چوس کر ہی پیٹ بھرا ہے جبکہ میں اپنی پیدائش کے دن سے آج تک صرف اذیتیں ہی جھیلتا رہا ہوں۔ اس لئے میں آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ سے برتر ہوں اور ہر لحاظ سے آپ سے زیادہ اہلیت رکھتا ہوں مجھے کچھ پڑھانا آپ کا کام نہیں۔"

"آپ کو ہم خیال بنانے کی میں ذرا بھی خواہش نہیں رکھتا" اندریئی یفیمچ نے دھیرے سے یوں اداسی کے ساتھ کہا جیسے اپنی بات کے غلط ڈھنگ سے سمجھے جانے سے دکھی ہو۔ "اور اصل بات یہ ہے بھی نہیں میرے دوست' اس حقیقت کو کہ میں نے تکالیف نہیں جھیلیں اور آپ نے جھیلی ہیں' ہم انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں' ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ اور میں سوچ سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے میں ایسے افراد کو دیکھ رہے ہیں جو غور وفکر اور بحث مباحثے کی اہلیت رکھتے ہیں اور یہ چیز ہمارے خیالات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں' ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کو جنم دیتی

ہے' کاش! آپ کو معلوم ہو سکتا کہ میں ہبہ گیر مخبوط الحواسی' علمی سطحیت اور حماقت سے کتنا بیزار ہوں اور کتنی خوشی ہوتی ہے مجھے آپ سے باتیں کر کے میرے دوست! آپ ذہین ہیں' اسی لئے آپ کی رفاقت میں لطف اندوز ہوتا ہوں۔''

خوبوتوف نے دروازے کو ذرا سا کھول کے اندر جھانکا۔ ایوان دمیترچ اپنی رات کی ٹوپی پہنے پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور بغل ہی میں ڈاکٹر بھی بیٹھا تھا۔ پاگل بار بار منہ بنا رہا تھا' چونک پڑتا تھا اور کپکپاہٹ کے ساتھ لبادے کو جسم پر لپیٹنے لگتا تھا جبکہ ڈاکٹر سر جھکائے' تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا' بے بس اور سوگوار سا۔ خوبوتوف نے شانے اچکائے' مسکرایا اور نیکیتا سے آنکھیں چار کیں۔ اس نے بھی اپنے شانے اچکائے۔

اگلے روز خوبوتوف طبی معاون کو اپنے ساتھ بلا لایا اور دونوں نے گزرگاہ میں ساتھ ساتھ کھڑے ہو کے بات چیت سنی۔

''لگتا ہے ہمارے بڑے میاں کا کچھ دماغ چل گیا!'' دونوں باہر نکل رہے تھے تو خوبوتوف نے کہا۔

''خدا ہم بدبخت گنہگاروں کو معاف کرے'' دین دار سرگیئی سرگیچ نے احاطے میں گڑھوں سے احتیاط سے کتراتے ہوئے تاکہ اس کے پالش سے چمچماتے ہوئے لانگ بوٹوں پر کیچڑ نہ لگے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ سے سچ کہہ رہا ہوں محترمی یوگینی فیورچ کہ میں تو عرصے سے اس کی توقع کر رہا تھا!''

خوبوتوف کے وارڈ نمبر 6 کے دروازے تک آنے کے چند ہی دنوں بعد اندریئی یفیمچ نے محسوس کیا کہ اس کے گرد کا ماحول پراسرار سا ہو گیا ہے۔ اسپتال کے خدمت گار' نرسیں اور مریض اس کا سامنا ہوتے ہی نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لینے لگتے اور وہ ان کے پاس سے ہو کے آگے بڑھ جاتا تو فوراً ہی کھسر پھسر شروع کر دیتے۔ سپرنٹنڈنٹ کی بچی ماشا سے وہ اسپتال کے باغ میں مل کے خوش ہوا کرتا تھا لیکن اب

اس کے بالوں کو سہلانے کے لئے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھتا تو وہ بھاگ کھڑی ہوتی۔ پوسٹ ماسٹر میخائیل آویریانچ اس کی پرجوش باتوں کے دوران اپنے معمول کے مطابق "بالکل سچ ہے" کہنے کے بجائے اب ناقابل توجیہہ گھبراہٹ سے "یقیناً یقیناً" کہتا اور اسے کھوئی کھوئی اداس نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔ جانے کیوں اس نے اب اپنے دوست کو مشورہ دینا شروع کیا کہ وہ بیئر اور وادکا سے ناتا توڑ لے لیکن اس بات کو وہ اپنی شائستگی کی بنا پر ذرا گھما پھرا کر اشاروں کنایوں میں کہتا تھا۔ وہ کبھی اپنے بٹالین کمانڈر کی بات چھیڑ دیتا اور کبھی رجمنٹ کے پادری کی اور اندریئی یفیمچ سے کہتا کہ دونوں ہی بڑے اچھے آدمی تھے جو شراب کی لت کے پیچھے اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن اسے چھوڑتے ہی بالکل ٹھیک ہو گئے۔ دو ایک بار اس کا ساتھی خوبوتوف اس کے ہاں آیا تو اس نے بھی ترک مے کا مشورہ دیا اور باتوں ہی باتوں میں یہ بھی کہہ گیا کہ اندریئی یفیمچ کو پوٹاشیم برومائیڈ استعمال کرنا چاہئے جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔

اگست میں اندریئی یفیمچ کو میونسپل کونسل کے چیئرمین کا خط ملا جس میں اسے کسی بہت ضروری کام سے طلب کیا گیا تھا۔ وہ ٹاؤن ہال پہنچا تو وہاں اس نے علاقے کے فوجی سربراہ، ضلع اسکول انسپکٹر، میونسپلٹی کے ایک ممبر، ڈاکٹر خوبوتوف اور ایک اور لحیم شحیم بھورے بالوں والے شخص کو جس کا اس سے ڈاکٹر کہہ کر تعارف کرایا گیا، اپنا منتظر پایا۔ دشوار پولستانی نام والا یہ ڈاکٹر تیس ورسٹ دور گھوڑوں کے ایک فارم پر رہتا تھا اور وہ قصبے سے صرف گزر رہا تھا۔

"ہمیں ایک درخواست موصول ہوئی ہے جس کا آپ سے بھی کچھ تعلق ہے" صاحب سلامت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد سب لوگ میز کے گرد بیٹھ گئے تو میونسپل ممبر نے اندریئی یفیمچ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "درخواست میں یوگینی فیدروچ نے کہا ہے کہ دواخانے کے لئے خاص عمارت میں کافی جگہ نہیں ہے، اس لئے اسے بازو والے حصے میں منتقل کر دیا جانا چاہئے۔ ہمارے لئے دردسر جگہ کی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ہے کہ نئی جگہ کی مرمت کرنی ہوگی۔"

"جی ہاں! مرمت کی تو بے حد ضرورت ہے" اندریئی یفیمچ نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔ "مثال کے طور پر دوا خانے کو اگر بالکل کونے والے حصے میں منتقل کیا جائے گا تو میرے خیال میں اس جگہ کی مرمت پر کچھ نہیں تو پانچ سو روبل تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔ بالکل بے ثمر اخراجات......"

ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

"مجھے دس سال قبل بھی آپ سے یہ عرض کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا" اندریئی یفیمچ نے دھیرے دھیرے اپنی بات جاری رکھی "کہ یہ اسپتال اپنی موجودہ حالت میں ایسے تعیش کی حیثیت رکھتا ہے جسے قصبے کے وسائل برداشت نہیں کر سکتے۔ اسے پانچویں دہائی میں تعمیر کیا گیا تھا جبکہ حالات بالکل مختلف تھے۔ میونسپل کونسل غیر ضروری عمارتوں اور فالتو تقریریوں پر بہت زیادہ رقوم صرف کرتی ہے۔ انتظامات مختلف ڈھنگ سے کئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ اتنی ہی رقم سے دو بہت اچھے اسپتال چلائے جا سکتے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں مختلف ڈھنگ سے ہی انتظامات کرنے چاہئیں!"

میونسپل ممبر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس مسئلے پر اس سے قبل بھی اپنی رائے ظاہر کرنے کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ اسپتال چلانے کی ذمہ داری زیمستوو کے سپرد کر دی جانی چاہئے۔"

"جی ہاں! بے شک' بے شک' ہم اپنے سارے فنڈز زیمستوو کو دے دیں تاکہ وہ ان پر ہاتھ صاف کر سکے" بھورے بالوں والے ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! جی ہاں!" میونسپل ممبر نے بھی ہنستے ہوئے اس سے اتفاق رائے کیا۔

اندریئی یفیمچ نے دھندلی نظروں سے بھورے بالوں والے ڈاکٹر کو دیکھا اور کہا:

"ہمیں ذرا انصاف سے کام لینا چاہئے۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اتنے میں چائے لگا دی گئی۔ فوجی سربراہ نے جو جانے کیوں بہت نادم سا نظر آرہا تھا' اپنا ہاتھ پھیلا کے میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے

اندریئی یفیمچ کا ہاتھ چھو لیا اور کہا:

"ارے ڈاکٹر صاحب! آپ تو لگتا ہے کہ ہم لوگوں کو بھول ہی گئے۔ ویسے تو میں جانتا ہوں کہ آپ نے تو ایک طرح سے سنیاس ہی لے رکھا ہے' نہ تاش کھیلتے ہیں نہ عورتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کو ہماری صحبت بے کیف لگتی ہو گی۔"

پھر ہر شخص کہنے لگا کہ اہل ذوق کو یہ قصبہ واقعی بڑا بے کیف لگتا ہو گا۔ نہ کوئی تھیٹر ہے نہ موسیقی اور حالت یہ ہے کہ کلب میں گزشتہ رقص کے موقعے پر عورتیں بیس آ گئی تھیں پر ان کا ساتھ دینے کے لئے مرد بس دو ہی تھے۔ نوجوانوں کو رقص سے دلچسپی نہیں' یا تو بار میں اکٹھا رہتے ہیں یا تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ سب سن کے اندریئی یفیمچ نے کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنی پرسکون' د 'آواز سے کہنا شروع کیا کہ "افسوس' صد افسوس' قصبے کے لوگ اپنی توانائی کو' روحوں اور ذہنوں کو تاش اور گپ بازی میں ضائع کرتے ہیں' دلچسپ گفتگو میں وقت گزارنے کے نہ اہل ہیں نہ خواہاں اور ذہنی انبساط سے محظوظ ہونے تو جیسے کوئی تیار ہی نہ ہو۔ صرف ذہن ہی دلچسپ اور شاندار ہے' باقی سب کچھ ہیچ۔" خوبوتوف نے اپنے ساتھی ڈاکٹر کی یہ باتیں بڑے غور سے سنیں اور پھر اچانک قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا:

"آج تاریخ کیا ہے' اندریئی یفیمچ؟"

جواب پانے کے بعد اس نے اور بھورے بالوں والے ڈاکٹر نے اندریئی یفیمچ سے اور بھی سوالات کئے مثلاً یہ کہ آج دن کون سا ہے' سال میں کتنے دن ہوتے ہیں اور کیا یہ سچ ہے کہ وارڈ نمبر 6 میں کوئی شاندار پیغمبر رہتا ہے۔ دونوں کا لہجہ ان ممتحنوں کے جیسا تھا جنہیں خود اپنی نااہلی کا احساس ہو۔

آخری سوال کا جواب دیتے وقت اندریئی یفیمچ کا چہرہ کچھ تمتما سا اٹھا اور اس نے کہا:

"جی ہاں! وہ بیمار آدمی ہے لیکن ہے بہت دلچسپ۔"

اس کے بعد اور سوالات نہ پوچھے گئے۔

وہ برآمدے میں اوورکوٹ پہن رہا تھا تو فوجی سربراہ نے اس کے پاس پہنچ کر شانے کو تھپتھپایا' ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:

''وقت آ گیا ہے کہ ہم بوڑھے لوگ سبکدوش ہونے کے متعلق سوچنا شروع کر دیں!''

ٹاؤن ہال سے نکلتے وقت اندریئی یفیمچ کی سمجھ میں آیا کہ دراصل اسے کمیشن کے سامنے طلب کیا گیا تھا جو اس کی ذہنی حالت کی جانچ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس سے جو سوالات پوچھے گئے تھے انہیں یاد کر کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور زندگی میں پہلی بار علم طب کی زبوں حالی پر اسے افسوس سا ہوا۔

''اوہ خدا!'' اس نے یہ یاد کرتے ہوئے کہ دونوں ڈاکٹروں نے اس کی جانچ کس ڈھنگ سے کی تھی' سوچا' ''یہ لوگ تو ابھی حال ہی میں دماغی امراض کے علاج سے متعلق لیکچروں میں شریک ہوئے تھے اور امتحانات بھی دیئے تھے تو پھر آخر یہ لاعلمی کیسی' اتنی جہالت کیوں؟ یہ تو اس میدان میں بالکل ہی کورے نکلے!''

اور اسے زندگی میں پہلی بار ذلیل کئے جانے کا احساس ہوا' وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔

اسی روز شام کو میخائیل آوریانچ اس سے ملنے آیا۔ اس نے رک کے صاحب سلامت تک نہ کی' سیدھا اندریئی یفیمچ کے سامنے پہنچا' اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا اور بڑی جذباتی آواز سے کہنے لگا:

''عزیز ترین دوست! ثبوت دیجئے کہ آپ اپنے سلسلے میں میرے جذبات کے خلوص میں یقین رکھتے اور مجھے اپنا دوست تصور کرتے ہیں.....عزیز ترین دوست!'' اور اس نے اندریئی یفیمچ کو زبان کھولنے کا موقع دیئے بغیر ہیجانی انداز میں بات جاری رکھی: ''میں آپ کی علمیت اور شرافت نفس کی بنا پر آپ سے محبت کرتا ہوں۔ ذرا غور سے سنئے' میرے دوست! ڈاکٹروں کے پیشہ ورانہ آداب انہیں آپ سے حقیقت کو راز میں

رکھنے پر مجبور کر رہے ہیں لیکن میں ٹھہرا سپاہی' صاف گوئی سے کام لوں گا: آپ علیل ہیں! مجھے معاف کیجئے گا' عزیز دوست! لیکن حقیقت یہی ہے اور یہ کافی دنوں سے آپ کے اردگرد کے لوگوں کی نگاہوں میں ہے۔ یوگینی فیدورچ مجھ سے ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ آپ کو اپنی صحت کا خیال کر کے کچھ آرام کرنا اور کام سے توجہ ہٹانا چاہئے۔ بالکل سچ! شاندار! چند دنوں بعد میں چھٹی لینے والا ہوں اور ہوا خوری کے لئے کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے مجھ سے اپنی دوستی کا ثبوت دیجئے' میرے ساتھ چلئے چلئے اور ہمیں اپنا کھویا ہوا شباب مل جائے گا!''

''لیکن میں تو بھلا چنگا ہوں' اندریئی یفیمچ نے قدرے توقف سے کہا۔'' اور میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ مجھ سے اپنی دوستی کا ثبوت اور کسی طرح لے لیجئے نا۔''

کتابوں اور واریا کو چھوڑ کر' گزشتہ بیس برسوں کے اس سارے معمول کو توڑ کے بلاسبب ہی کہیں جانے کا خیال پہلے تو اسے انتہائی احمقانہ اور عجیب وغریب سا لگا۔ لیکن جب اس نے یاد کیا کہ ٹاؤن ہال میں کیا کہا گیا تھا' وہاں سے گھر لوٹتے وقت وہ کتنا دل شکستہ تھا تو قصبے کو جہاں عقل کے اندھے اسے پاگل سمجھ بیٹھے تھے' کچھ دنوں کے لئے چھوڑ دینے کی تجویز اچانک دل میں بیٹھ گئی۔

''آپ جائیں گے کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''ماسکو' پیٹرس برگ' وارسا...... وارسا میں تو میں پانچ سال گزار چکا ہوں اور یہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ لاجواب شہر ہے! میرے ساتھ چلئے ضرور' عزیز دوست!''

ہفتے بھر بعد اندریئی یفیمچ سے کہا گیا کہ وہ آرام کر سکتا ہے' دوسرے الفاظ میں اس نے استعفا طلب کیا گیا جسے اس نے انتہائی بےفکری کے ساتھ دے دیا اور مزید ایک ہفتے بعد وہ میخائیل آویریانچ کے پہلو میں ڈاک بگھی پر بیٹھا ہوا قریب ترین ریلوے اسٹیشن کو جا رہا تھا۔ موسم سرد لیکن خوشگوار تھا' آسمان نیلگوں اور فضائیں صاف وشفاف۔

ان لوگوں نے اسٹیشن تک دو سو ورسٹ کا فاصلہ دو دنوں میں طے کیا اور رات گزارنے کے لیے دو بار ٹھہرے۔

راستے میں ٹھہرنے کی جگہوں پر انہیں اگر گندے گلاسوں میں چائے پیش کی جاتی یا ان کے گھوڑوں کو بگھی میں جوتنے میں زیادہ عجلت نہ برتی جاتی تو میخائیل آویریانچ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا' سر سے پاؤں تک کانپنے لگتا اور زور سے چلاتا: ''خاموش! بحث کی اجازت نہیں!'' بگھی کے اندر اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی' قفقاز اور پولینڈ میں اس کے سفروں کے قصے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ کیسے کیسے سنسنی خیز واقعات پیش آئے تھے! کیسے کیسے لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہوئی تھیں! وہ جس طرح چیخ چیخ کے بول رہا تھا' اظہارِ حیرت کے لئے جس طرح آنکھیں مٹکا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ساری ڈینگ سفید جھوٹ ہی ہے۔ اس سب پر طرہ یہ کہ وہ اپنی سانسیں اندریئ یفیمچ کے عین چہرے پر خارج کرتا اور اس کے کان میں ہنستا تھا جس سے ڈاکٹر بے چین ہو اٹھتا تھا اور اپنے خیالوں میں نہیں کھو پاتا تھا۔

ان لوگوں نے پیسے بچانے کے خیال سے تیسرے درجے میں سفر کیا اور غیر تمباکو نوشوں والے ڈبے میں بیٹھے۔ آدھے مسافر خود انہی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میخائیل آویریانچ نے جلد ہی ان سبھوں سے دوستانہ روابط قائم کر لئے اور کبھی ایک بنچ پر اور کبھی دوسری پر بیٹھ کر بلند آواز سے انہیں قائل کرنے لگا کہ ایسے واہیات راستوں پر انہیں سفر کرنے سے انکار کر دینا چاہئے۔ چاروں طرف بے ایمانی کا دور دورہ ہے! یہ سفر گھڑ سواری سے کتنا مختلف ہے: آپ دن بھر میں سو ورسٹ طے کرتے ہیں پھر بھی اس کے بعد تازگی محسوس کرتے ہیں۔ ہماری فصلیں جو خراب ہوتی ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ پسک دلدلی علاقوں کو پانی نکال کر خشک کر دیا گیا ہے۔ جدھر دیکھئے ادھر بد نظمی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ جوش و خروش میں چلا چلا کر بولتا جا رہا تھا اور کسی دوسرے کو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اس مسلسل بک بک سے جس کے دوران وہ اپنی باتوں پر زور دینے کے لئے ہاتھوں سے اشارے کر رہا تھا اور بار بار کان

کے پردے پھاڑ دینے والے قہقہے بلند کرتا تھا' اندریئی یفیمچ کا دم ناک میں آ گیا۔

"ہم دونوں میں سے پاگل کسے تصور کیا جانا چاہئے؟" اس نے جھلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ "مجھ کو جو کوشاں ہے کہ اپنے ساتھی مسافروں پر بار نہ بنے یا اس خود پسند کو جس کا خیال ہے کہ پورے ڈبے میں ذہین اور دلچسپ شخص صرف وہی ہے اور کسی کو پل بھر بھی چین نہیں لینے دے رہا ہے؟"

اسکو پہنچ کر میخائیل آویریانچ نے فوجی کوٹ جس کے شانوں پر جھبے نہیں لگے تھے اور پتلون جس کے پائینچوں کی سیونوں پر اوپر سے نیچے سرخ فیتے سلے ہوئے تھے' پہن لیا۔ وہ فوجی ٹوپی اور اوور کوٹ پہن کر باہر نکلتا تھا اور سڑکوں پر سپاہی اسے سلامی دیتے تھے۔ اندریئی یفیمچ کو اب وہ ایک ایسا شخص نظر آیا جس نے دیہی شرفا کی تمام اچھائیاں اڑا دی ہوں اور اس کے پاس صرف برائیاں ہی باقی بچی ہوں۔ ضرورت نہ ہو تب بھی اسے دوسروں سے خدمت لینے کا بڑا شوق تھا۔ ماچس کی ڈبیا سامنے میز پر رکھی ہوتی' اسے دیکھتا پھر بھی چلا کے نوکر کو پکارتا اور کہتا کہ ماچس اٹھا دو' خادمہ کی موجودگی میں بھی صرف اندرونی کپڑے پہنے پہنے ادھر ادھر آنے جانے میں عار نہیں کرتا تھا' نوکروں کو خواہ سن رسیدہ ہی کیوں نہ ہوں "تم" کہہ کر ہی مخاطب کرتا اور غصے میں ہوتا تو انہیں بے وقوف اور بدمعاش بھی کہہ دیا کرتا تھا۔ اندریئی یفیمچ جانتا تھا کہ دیہی شرفا کا وطیرہ ہی یہی ہے پر اسے ان حرکتوں پر سخت تنفر محسوس ہوتا۔

میخائیل آویریانچ نے سرگرمیوں کا آغاز اپنے دوست کو ایویرسکایا خانقاہ میں عبادت کے لئے لے جا کر کیا۔ خود اس نے سر کو زمین تک جھکا کر' ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بڑے خضوع و خشوع سے عبادت کی جس کے بعد گہری ٹھنڈی سانس لی اور کہا:

"آدمی دین دار نہ ہو تب بھی عبادت سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ شبیہہ کا بوسہ لیجئے' میرے دوست!"

اندریئی یفیمچ نے بھونڈے پن سے جھک کر ہدایت پر عمل کیا لیکن اس اثناء میں

میخائل آودریانچ نے اپنے ہونٹ سکوڑے، چپکے چپکے پھر دعا مانگی اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو تیرنے لگے۔ اس کے بعد وہ دونوں کریملن گئے، شاہی توپ اور گھنٹے کو دیکھا اور انہیں اپنی انگلیوں کی نوکوں سے چھوا بھی۔ دریا کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ دونوں حضرت عیسیٰ کے گرجے میں گئے اور رومیانسیف میوزیم دیکھا۔

کھانا تیستوف ریستوران میں کھایا گیا۔ میخائیل آودریانچ اپنے گل مچھوں کو تھپتھپا تھپتھپا کے فہرست طعام کو دیر تک پڑھتا رہا، پھر کھانوں اور شرابوں کے کسی ماہر کے لہجے میں جو ریستوران آنے کا عادی ہو، ویٹر سے کہا:

''دیکھتے ہیں کہ آج آپ کاہے سے ہماری ضیافت کرتے ہیں!''

ڈاکٹر ہر جگہ جاتا، سب کچھ دیکھتا، کھاتا پیتا لیکن میخائیل آودریانچ سے شدید الجھن کے سوا اور کوئی کیفیت اس کے ذہن پر نہ طاری ہوتی۔ وہ اپنے دوست کی مسلسل موجودگی سے تنگ آ چکا تھا، اس سے جان چھڑانے اور کہیں چھپ جانے کو بے تاب ہو رہا تھا، پر میخائیل آودریانچ تو سائے کی طرح ساتھ لگے رہنے اور حتی الامکان اس کا دل بہلانے کو اپنا فرض تصور کر رہا تھا۔ کوئی چیز دیکھنے کو نہیں ہوتی تھی تو وہ اپنی باتوں سے تفریح کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اندریئی یفیمچ نے یہ سب دو دنوں تک تو جوں توں جھیلا لیکن تیسرے روز طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے کہا کہ وہ تمام دن باہر نہ نکلے گا۔ اس کے دوست نے کہا کہ اس صورت میں وہ بھی کہیں نہ جائے گا نیز یہ کہ واقعی آرام کی ضرورت ہے ورنہ پیدل چلتے چلتے ان لوگوں کے پاؤں جواب دے جائیں گے۔ اندریئی یفیمچ نے صوفے پر لیٹ کے منہ دیوار کی طرف موڑ لیا اور بھنچے ہوئے دانتوں کے ساتھ اپنے دوست کی باتیں سننے لگا جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسے یقین دلا رہا تھا کہ فرانس دیر سویر جرمنی کے پرخچے اڑا دے گا اور یہ کہ ماسکو ٹھگوں سے بھرا پڑا ہے اور جہاں تک گھوڑوں کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں ان کی صرف خوبیوں کی بنیاد پر قطعی رائے نہ قائم کی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر کو اختلاج قلب اور اپنے

کاموں میں مسلسل بھن بھناہٹ کا احساس تھا لیکن اپنی شائستگی کی بناء پر دوست سے یہ نہ کہہ سکا کہ اسے یا تو تنہا چھوڑ دے یا خاموش ہو جائے۔ خوش قسمتی سے کمرے میں بیٹھے بیٹھے میخائیل آویریانچ کا جی اوب گیا اور دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ٹہلنے نکل کھڑا ہوا۔

تنہائی نصیب ہوتے ہی اندریئی یفیمچ بے حد پرسکون ہوگیا۔ کمرے میں تنہا ہونے کے احساس کے ساتھ صوفے پر بے حس و حرکت لیٹے رہنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ دراصل تنہائی کے بغیر حقیقی مسرت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ معتوب فرشتے نے خدا کی حکم عدولی شاید اسی لئے کی تھی کہ وہ تنہائی کی شدید خواہش رکھتا تھا جو فرشتوں کو میسر نہیں ہوتی۔ اندریئی یفیمچ نے گزشتہ دنوں میں جو کچھ دیکھا سنا تھا اس کے متعلق سوچنا چاہتا تھا لیکن میخائیل آویریانچ کا خیال اب بھی اس کے سر پر سوار تھا۔

"اور یہ صاحب خالص دوستی اور فیاضی کے جذبے سے رخصت لے کر میرے ساتھ گھومنے پھرنے نکلے ہیں!" ڈاکٹر نے جھلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ "کتنی واہیات ہوتی ہے اس قسم کی دوستانہ سرپرستی بھی! نیک ہیں، فیاض ہیں، زندہ دل ہیں، پر اس سب کے باوجود ہیں انتہائی عذاب جان۔ یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ اچھی سوجھ بوجھ کی باتیں کرتے ہیں پھر بھی احساس دلاتے ہیں کہ نرے احمق ہی ہیں۔"

بعد کے دنوں میں اندریئی یفیمچ نے اسے اپنا معمول سا بنا لیا، طبیعت کی خرابی کا عذر کرتا اور کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ اس کا دوست اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا تو وہ دیوار کی طرف منہ موڑے ہوئے لیٹے لیٹے کڑھتا رہتا اور اس کی عدم موجودگی میں آرام کرتا تھا۔ اسے اپنے پر بھی غصہ آتا تھا اور اپنے دوست کے اوپر بھی، اپنے دوست پر اس لئے کہ اس کے یاتونی پن اور بے تکلفی میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا جس کے نتیجے میں اندریئی یفیمچ اپنے سنجیدہ اور بلند خیالات پر توجہ نہیں مبذول کر پاتا تھا۔

"مجھے شاید اسی حقیقت نے اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا جس کا تذکرہ ایوان دمیترچ نے کیا تھا" اس نے خود کو اس خیال کی بناء پر کوستے ہوئے سوچا کہ وہ حقیر باتوں سے

بلند ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا۔" لیکن یہ سب بکواس ہے.....گھر واپس پہنچوں گا تو زندگی پھر اپنے پرانے ڈھرے پر چلنے لگے گی۔"

پیٹرسبرگ میں بھی یہی حالت رہی: وہ کئی کئی دنوں تک ہوٹل کے کمرے سے باہر نہ نکلتا' ہر وقت صوفے پر لیٹا رہتا تھا اور اٹھتا تھا تو صرف بیئر پینے کے لئے۔

میخائیل آویریانچ روز کہتا رہتا تھا کہ وارسا چلنے میں جلدی کرنی چاہئے۔

"میرے عزیز دوست! آخر میں' وارسا جا کے کیا کروں گا؟" اندریئی یفیمچ نے منت سماجت کے لہجے میں کہا۔" آپ خود چلے جائیے اور مجھے گھر واپس لوٹ جانے دیجئے۔ بڑی عنایت ہوگی۔"

"بھلا اس کا کیا سوال!" میخائل آویریانچ نے احتجاج کیا۔" بڑا شاندار شہر ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پانچ بہترین سال وہیں گزارے ہیں!"

اندریئی یفیمچ کو اپنی بات پر اڑ جانا آتا ہی نہ تھا اس لئے مجبوراً اپنے دوست کے ساتھ وارسا چلا گیا۔ یہاں اس نے خود کو اپنے کمرے ہی تک محدود رکھا اور خود اپنے آپ سے' اپنے دوست سے اور روسی سمجھنے سے قطعاً انکار کرنے والے ہوٹل کے ملازمین سے بری طرح بھنایا ہوا صوفے پر لیٹا رہتا۔ اس کے برعکس میخائل آویریانچ ہمیشہ کی طرح صحت و توانائی کا پیکر بنا ہوا صبح سے رات تک شہر میں گھومتا اور اپنے پرانے دوستوں کو تلاش کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ ساری ساری رات بھی غائب رہتا تھا۔ ایک بار کسی نامعلوم جگہ پر رات گزارنے کے بعد صبح کو وہ لوٹا تو عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی' چہرہ تمتمایا ہوا اور بال الجھے الجھے سے۔ وہ کمرے میں دیر تک ٹہلتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا پھر ٹھہر کر بولا:

"آن بان کے آگے سب کچھ ہیچ!"

کمرے میں اور بڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد اس نے سر پکڑ کر بڑے اداس لہجے میں کہا:

"ہاں! آن بان کے آگے سب کچھ ہیچ! لعنت ہو اس لمحے پر جب اس بابل میں

آنے کا خیال میرے دل میں آیا تھا! عزیز ترین دوست' اس نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا'' جی چاہے تو مجھ سے نفرت کیجئے' اپنی رقم جوئے میں گنوا بیٹھا' مجھے پانچ سو روبل دے دیجئے!''

اندرئی یفیمچ نے پانچ سو روبل گن کے خاموشی سے دوست کو تھما دیئے۔ آخرالذکر نے جس کا چہرہ شرم اور غصے سے اب بھی سرخ ہو رہا تھا' بے ربطی سے قسم کھا کے غیر ضروری عہد کیا' ٹوپی پہنی اور باہر نکل گیا۔ دو گھنٹے کے بعد واپس لوٹ کے اس نے خود کو آرام کرسی پر گرا دیا' زور سے ٹھنڈی سانس لی اور کہا:

''میری آن بچ گئی! ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے' میرے دوست! اس کمبخت شہر میں اب پل بھر بھی نہیں ٹھہرنا چاہتا۔ ٹھگ کہیں کے! آسٹریائی جاسوس!''

وہ دونوں اپنی سیاحت سے واپس لوٹے تو نومبر کا مہینہ تھا اور سڑکوں پر برف کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر خوبوتوف جو اندرئی یفیمچ کی جگہ پر مامور ہو چکا تھا' اب بھی اپنے پرانے کمروں میں ہی مقیم اور منتظر تھا کہ اندرئی یفیمچ واپس لوٹ کر اسپتال کے فلیٹ کو خالی کرے اور وہ بدصورت عورت جسے وہ اپنی باورچن بتایا کرتا تھا' اسپتال کی عمارت کے ایک کنارے والے حصے میں منتقل ہو چکی تھی۔

قصبے میں اسپتال کے متعلق نئی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ وہ بدصورت عورت انسپکٹر سے کسی بات پر جھگڑ بیٹھی تھی اور انسپکٹر معافی مانگنے کے لئے اس کے قدموں پر گر پڑا تھا۔

اندرئی یفیمچ کو اپنی واپسی کے دن ہی اپنے لئے نئے جائے رہائش کی تلاش میں نکلنا پڑا۔

''عزیز ترین دوست!'' پوسٹ ماسٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا'' آپ میری ناشائستگی کو معاف کیجئے گا لیکن مہربانی کر کے بتائیے کہ آپ کے پاس کتنی رقم موجود ہے؟''

اندرئی یفیمچ نے گننے کے بعد کہا:

''چھیاسی روبل۔''

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میخائیل آویریانچ نے ڈاکٹر کے جواب سے متحیر ہو کے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ کے پاس کل رقم کتنی ہے؟"

"میں عرض تو کر رہا ہوں' چھیاسی روبل...... کل کائنات یہی ہے۔"

میخائیل آویریانچ ڈاکٹر کو ایماندار اور عالی ظرف آدمی تصور کرتا تھا پھر بھی اسے یقین تھا کہ کچھ نہیں تو بیس ہزار روبل تو بچا کے کہیں رکھ ہی چھوڑے ہوں گے۔ اب جو اسے پتا چلا کہ اندریئی یفیمچ بالکل کنگال ہے' گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتا تو وہ اچانک رو پڑا اور اپنے دوست کو لپٹا لیا۔

اندریئی یفیمچ نے نچلے متوسط طبقے کی ایک عورت بیلووا کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ اس چھوٹے سے گھر میں باورچی خانے کو چھوڑ کے کل تین ہی کمرے تھے۔ دو کمرے جن کا رخ سڑک کی طرف تھا' ڈاکٹر کے پاس اور واریا' مکان مالکن اور اس کے تینوں بچے تیسرے کمرے اور باورچی خانے میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی مالکن کا نشے باز' غصیلا آشنا رات بسر کرنے کے لئے آتا تھا اور واریا اور بچے بری طرح خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ وہ باورچی خانے میں کرسی پر بیٹھ کر واد کا طلب کرنے لگتا تھا تو گھر اچانک بہت زیادہ تنگ نظر آنے لگتا اور ڈاکٹر روتے ہوئے بچوں پر ترس کھا کے اپنی کمرے میں بلا لے جاتا' فرش پر ان کے بستر بچھا دیتا اور اس طرح اسے بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوتا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق اب بھی سو کے آٹھ بجے ہی اٹھتا تھا اور چائے پینے کے بعد پرانی کتابیں اور رسالے پڑھنے لگتا۔ نئی کتابوں کی خریداری کا اب سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن اب مطالعے میں یا تو کتابیں پرانی ہونے کی وجہ سے یا پھر شاید بدلے ہوئے ماحول کے باعث وہ پہلے کی طرح کھو کے نہیں رہ جاتا تھا' اب تو مطالعہ اسے ہلکان کر دیتا تھا۔ اس لئے خود کو مصروف رکھنے کی خاطر اس نے اپنی کتابوں کی تفصیلی فہرست مرتب کی۔ ہر کتاب کے پیچھے لیبل چپکائے اور یہ میکانکی کام اس کے

لئے مطالعے سے زیادہ جاذب توجہ ثابت ہوا۔ یہ غیر دلچسپ' محنت طلب کام کسی عجیب و غریب انداز سے اس کے خیالات کو تھپکیاں دے کے سلاتا' معلوم ہوتا تھا وہ بالکل خالی الذہن ہو کے کام کرتا رہتا تھا اور وقت تیزی سے گزر جاتا تھا۔ اسے تو باورچی خانے میں آلو چھیلنے یا واریا کے ساتھ اناج کو چن کر صاف کرنے میں بھی لطف آتا تھا۔ سنیچر اتوار کو وہ گرجا جایا کرتا تھا جہاں دیوار کی ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے کئے مختلف مذاہب کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ گرجے میں اسے بڑا سکون ملتا' اس پر اداسی طاری ہو جاتی اور واپس لوٹتے وقت افسوس ہوتا کہ عبادت اتنی جلدی ختم ہو گئی۔

دوبار وہ ایوان دمیترچ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لئے اسپتال گیا لیکن دونوں بار اسے سخت ہیجان اور غصے میں مبتلا پایا۔ ایوان دمیترچ نے التجا کی کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے' کہنے لگا: میں خالی خولی لفاظی سے تنگ آ چکا ہوں جتنی اذیتیں جھیل چکا ہوں' ان کا لعنت زدہ' کمینے لوگوں سے صرف ایک ہی ہرجانہ مانگ رہا ہوں.....قید تنہائی۔ کیا مجھے اس سے بھی محروم رکھا جائے گا؟ دونوں بار اندریئی یفیمچ نے اس سے رخصت ہوتے وقت شب بخیر کہا تو ایوان دمیترچ غصے سے چلایا۔

''دفان ہو جاؤ!''

اندریئی یفیمچ فیصلہ نہ کر سکا کہ تیسری بار بھی جائے حالانکہ جی بہت چاہتا تھا۔

اگلے وقتوں میں وہ دن کے کھانے کے بعد اپنے گھر کے اندر ٹہل ٹہل کر سوچتا رہتا تھا لیکن اب وہ شام کی چائے کے وقت تک دیوار کی طرف منہ کئے ہوئے صوفے پر لیٹے لیٹے چھوٹی چھوٹی فکروں میں الجھا رہتا اور ان سے نجات نہ حاصل کر پاتا۔ اس کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی تھی کہ بیس برسوں سے زائد عرصے تک ملازمت کے بعد نہ کوئی پنشن ملی تھی نہ عطیہ۔ وہ یہ تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیئے تھے پر بار بار سوچتا کہ ملازمت کرنے والے ایماندار ہوں یا بے ایمان' پنشن کے مستحق تو بہرحال ہوتے ہی ہیں۔ انصاف کا جدید تصور ہی اسی حقیقت پر مبنی ہے کہ مرتبے' تمغے اور پنشن اخلاقی صفات یا اہلیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ خدمات کی وجہ سے

خواہ وہ کیسی بھی کیوں نہ رہی ہوں، دیئے جاتے ہیں۔ تو پھر آخر ایک اسی کو کیوں محروم رکھا گیا؟ وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو رہا تھا۔ دوکان کے سامنے سے گزرتے اور دوکاندار سے آنکھیں چار کرتے وقت اسے شرم آتی تھی۔ بیئر کی قیمت کے سلسلے میں اس پر بتیس روبل چڑھ چکے تھے۔ مکان مالکن میلووا کا حساب بھی چکایا نہیں جا سکا تھا۔ واریا نے اندریئی یفیمچ کے پرانے کپڑوں اور کتابوں کو چوری چھپے فروخت کر دیا تھا اور مالکن سے کہا تھا کہ ڈاکٹر کو جلد ہی ڈھیروں پیسے ملنے والے ہیں۔

وہ اپنے اوپر رہ رہ کے جھنجھلاتا کہ سفر پر ایک ہزار روبل اڑا دیے۔ جو کچھ پس انداز کیا تھا سب کا سب! ان برے وقتوں میں وہ ہزار روبل کتنے کام آتے! سب سے زیادہ پریشانی اسے تنہائی نہ میسر ہونے سے تھی۔ خوبوتوف اپنے بیمار رفیق کو جلدی جلدی دیکھنے آنے کو اپنا فرض تصور کئے ہوئے تھے۔ اس کا چکنا چپڑا چہرہ، ناشائستہ سرپرستانہ لب و لہجہ اس کے ''رفیق'' کہنے کا انداز اس کے لانگ بوٹ...... ساری چیزوں سے اندریئی یفیمچ کو سخت گھن محسوس ہوتی تھی۔ سب سے گھناؤنی بات خوبوتوف کا یہ خیال تھا کہ وہ اندریئی یفیمچ کی دیکھ بھال اور علاج کر رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پوٹاشیم برومائیڈ کی ایک شیشی اور کچھ خاکستری سفوف لانا کبھی نہیں بولتا تھا۔

میخ ئیل آویریانچ بھی اپنے دوست سے ملاقات کے لئے آتے رہنے اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرنے کو اپنا فرض تصور کر رہا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ، خود کو زبردستی بہت مسرور ظاہر کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا اور فوراً ہی اندریئی یفیمچ کو یقین دلانے لگتا کہ وہ بھلا چنگا نظر آ رہا ہے، خدا کا شکر ہے کہ روبہ صحت ہے جس کا مطلب صرف یہ ہوتا تھا کہ دوست کی حالت کو لاعلاج تصور کرتا ہے۔ وارسا میں اس نے جو رقم ادھار لی تھی اسے اب تک ادا نہیں کیا تھا جس سے اس کو سخت ندامت محسوس ہوتی تھی۔ اس شرم پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ کچھ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے اور کچھ اور بھی مضحکہ خیز قصے بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ الٹے سیدھے قصے اور اس کی باتیں شیطان کی آنت کی طرح طول کھینچتی رہتیں اور ان سے اندریئی یفیمچ کو بھی کوفت محسوس

ہوتی اور خود اس کو بھی۔

اس کی آمد کے موقع پر اندریئی یفیچ عموماً صوفے پر اس کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ جاتا اور دانت بھینچ بھینچ کر اس کے قصے سنتا رہتا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی روح کے اوپر غلیظ جھاگ کی تہیں جمتی جا رہی ہیں جو اس کے دوست کی ہر آمد کے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ اونچی ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

ان حقیر جذبات کا گلا گھونٹ دینے کے لئے اس نے خود کو اس تصور کا سہارا لینے پر مجبور کیا کہ دیر سویر وہ خود، خوبوتوف اور میخائیل آویریانچ اپنے پیچھے خفیف ترین نقش چھوڑے بغیر ہی فنا ہو جائیں گے۔ اگر کسی ایسی روح کا تصور کیا جا سکے جو اب سے دس لاکھ سال بعد کرۂ ارض کے اوپر سے خلا میں پرواز کرتی ہوئی گزرے گی۔ تہذیب و تمدن، اخلاقی قوانین سب کچھ فنا ہو جائے گا اور کہیں گھاس کی ایک کونپل تک نہیں اگے گی۔ تو پھر آخر اس کے جذبات کو لگنے والی ٹھیس، دوکاندار کے سامنے اس کے احساسِ ندامت، ادنیٰ شخص خوبوتوف اور میخائیل آویریانچ کی وبال جان دوستی کی حیثیت ہی کیا ہے؟ محض حقیر کوڑا کرکٹ اور بس۔ لیکن اس قسم کی دلیلوں سے بھی اب اسے تسکین نہیں حاصل ہوتی تھی۔ وہ دس لاکھ سال بعد کے کرۂ ارض کو جیسے ہی اپنی نگاہوں کے سامنے لاتا ویسے ہی کسی برہنہ چٹان کے عقب سے کبھی خوبوتوف اپنے لانگ بوٹوں میں نمودار ہو جاتا تو کبھی زور زور سے قہقہے لگاتا ہوا میخائیل آویریانچ۔ اسے تو جھینپی جھینپی سی سرگوشی تک سنائی دینے لگتی تھی۔ ''اور جہاں تک وارسا والے قرضے کا تعلق ہے میرے عزیز دوست تو اسے میں چند ہی دنوں میں ادا کر دوں گا......'' ایک روز سہ پہر کو اندریئی یفیچ صوفے پر لیٹا ہوا تھا تو میخائیل آیوریانچ اس سے ملنے آیا۔ اتفاق کی بات کہ خوبوتوف بھی اپنے پوٹاشیم برومائیڈ کے ساتھ آ دھمکا۔ اندریئی یفیچ کوشش کر کے صوفے پر ہاتھ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''عزیز دوست!'' میخائیل آویریانچ نے کہنا شروع کیا' آج تو آپ کل سے بھی زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں۔ آپ کی صحت کا کہنا ہی کیا' واقعی شاندار نظر آ رہے

ہیں!"

"ہاں! میرے رفیق! وقت آ گیا ہے کہ اب آپ تندرست ہو جائیں" خوبوتوف بھی جمائی لے کر گفتگو میں شریک ہو گیا۔ "اس تمام چکر سے آپ خود ہی عاجز آ چکے ہوں گے۔"

"ہم ضرور تندرست ہو جائیں گے!" میخائیل آویریانچ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہم لوگ مزید سو برسوں تک زندہ رہیں گے۔ دیکھ لیجئے گا!"
"سو کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ مزید بیس سال تو بہر حال جی ہی سکتے ہیں" خوبوتوف نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "ارے کوئی بات نہیں، میرے رفیق...... ذرا حوصلے بلند رکھئے!"

"ہاں...... ہاں!" میخائیل آویریانچ نے قہقہہ لگایا' "آپ کو دکھا دیں گے ہم لوگ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں! دیکھ لیجئے گا! خدا نے چاہا تو اگلی گرمیوں میں ہم لوگ قفقاز جائیں گے' وہاں چاروں طرف گھوڑے دوڑاتے پھریں گے۔ ھاپ! ھاپ! ھاپ! اور جب قفقاز سے لوٹیں گے نا تو بہت ممکن ہے کہ ہمارے یہاں شادی کی کوئی تقریب ہو" میخائیل آویریانچ نے عیاری سے آنکھ ماری۔ "ہاں! میرے دوست' ہم آپ کی شادی کر دیں گے...... شادی......"
اچانک اندریئی یفیمچ کو لگا کہ جھاگ کی تہیں ابھر کے اس کے حلق تک پہنچ گئی ہیں۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "کیا بیہودگی ہے!" اس نے دفعتاً کھڑے ہو کر کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کہ آپ کتنی بیہودگی پر اتر آئے ہیں؟"

وہ نرم اور شائستہ لہجے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے مکّہ بھینچ کر اپنے سر کے اوپر اٹھا لیا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دیجئے!" وہ اپنی پوری قوت سے چلایا۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ "باہر جائیے! دونوں! نکل جائیے!"

میخائیل آویریانچ اور خوبوتوف کھڑے ہو کر اسے تکنے لگے' پہلے بوکھلاہٹ کے ساتھ اور پھر خوف سے۔

''آپ دونوں دفان ہو جایئے! احمق! مجھے دوستی نہیں چاہئے' مجھے آپ کی دوا بھی نہیں چاہئے! بیہودہ افراد! قابل نفرت!''

خوبوتوف اور میخائیل آویریانچ نے ایک دوسرے کو بوکھلاہٹ کے ساتھ دیکھا اور کمرے کے دروازے سے نکل کے گزرگاہ میں آ گئے۔ اندرئی یفیمچ نے پوٹاشیم برومائیڈ کی شیشی تیزی سے اٹھا کے ان دونوں کے پیچھے پھینکی جو دہلیز سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گئی۔

''دفان ہو جاؤ!'' وہ دوڑتا ہوا گزرگاہ میں ان دونوں کے پیچھے پہنچ کر گلوگیر آواز میں چلایا۔ ''چولھے بھاڑ میں جاؤ!''

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد اندرئی یفیمچ جس کا سارا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے وہ تپ لرزہ میں مبتلا ہو' صوفے پر لیٹے لیٹے ہڑبڑاتا رہا: ''احمق کہیں کے! گدھے!'' لیکن اس ہیجانی کیفیت کے ختم ہوتے ہی اس نے سوچا کہ اس وقت میخائیل آویریانچ پر جانے کیا بیت رہی ہو' یہ سارا واقعہ کتنا باعث شرم' کتنا مہیب ہے۔ اس پر اس قسم کی کیفیت کبھی بھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ آخر اس کی ذہانت اور عاقبت اندیشی' اس کی وسیع الخیالی اور فلسفیانہ بے اعتنائی کو کیا ہو گیا تھا؟

وہ اپنے طرزِ عمل سے اتنا زیادہ شرمندہ اور پریشان تھا کہ رات آنکھوں میں کاٹ دی اور صبح کو دس بجے کے قریب پوسٹ ماسٹر سے معافی مانگنے کے لیے ڈاک خانے گیا۔

''ہم گڑے مردے تھوڑی اکھاڑیں گے'' میخائیل آویریانچ نے جو ڈاکٹر کی آمد سے بہت متاثر ہوا تھا' ٹھنڈی سانس بھرتے اور گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ہو چکا اس کی فکر ہی کیا۔ لیوبافکین!'' وہ اتنے زور سے چلایا کہ ڈاک خانے کے سارے کلرک اور وہاں مختلف کاموں سے آنے والے افراد چونک پڑے۔ ''کرسی لاؤ!

اور تم انتظار کرو!'' اس نے ایک غریب عورت کو ڈانٹا جو سلاخوں کے اندر سے اسے کوئی خط رجسٹری کرنے کے لئے پکڑا رہی تھی۔ ''دیکھ نہیں رہی ہو کہ میں مصروف ہوں؟ ہاں تو جو کچھ ہو چکا اس کی فکر ہی کیا'' اس نے اندریئی یفیمچ سے مخاطب ہوتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مہربانی کر کے بیٹھ جایئے' میرے عزیز دوست۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا اپنے گھٹنوں کو ملتا رہا پھر کہنے لگا:

''مجھے آپ کا طرز عمل ایک لمحے کے لئے بھی ناگوار نہیں معلوم ہوا۔ میں بخوبی واقف ہوں کہ بیماری میں کسی شخص کی حالت کیسی ہوتی ہے۔ آپ نے کل جس طرح دھاوا بول دیا اس سے ڈاکٹر کو اور خود مجھے سخت تشویش ہوئی اور ہم دونوں میں آپ کے متعلق طویل گفتگو ہوئی۔ میرے عزیز ترین دوست! آخر آپ اپنی علالت کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ آپ کو ایسی لاپروائی زیب نہیں دیتی۔ میں آپ کا دوست ہوں' میری صاف گوئی کا معاف کیجئے گا'' اور میخائیل آویریانچ نے اپنی آواز سرگوشی کی حد تک نیچی کر لی' قصہ یہ ہے کہ آپ انتہائی ناخوشگوار ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں: جگہ تنگ ہے' چاروں طرف غلاظت بکھری ہوئی ہے' کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں اور علاج کے لئے پیسے نہیں...... عزیز دوست' ڈاکٹر کی اور خود میری آپ سے درخواست ہے کہ ہمارا کہا مان لیجئے' اسپتال میں بھرتی ہو جایئے! اسپتال میں بہت عمدہ غذا ملتی ہے' آپ کی معقول دیکھ بھال ہو گی اور بیماری کا علاج ہو جائے گا۔ خوبوتوف' بات ہم دونوں ہی تک رہے' آدمی تو کوڑی کے کام کا نہیں پر ڈاکٹر اچھا اور قابل اعتماد ہے۔ اس نے آپ کی دیکھ بھال کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔''

اندریئی یفیمچ مخلصانہ تشویش کے لہجے اور آنسوؤں سے جو اچانک پوسٹ ماسٹر کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے' بہت متاثر ہوا۔

''میرے انتہائی قابل احترام دوست' ان لوگوں کے جھانسے میں نہ آیئے!'' اسنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر چپکے سے کہا۔

''آپ ان کی بات پر یقین نہ کیجئے! یہ سب جھوٹ ہے' سفید جھوٹ! میری واحد

بیماری یہ ہے کہ ان بیس برسوں میں قصبے میں میری ملاقات صرف ایک ہی ذہین شخص سے ہوئی ہے اور وہ بھی پاگل ہے۔ میں قطعاً بیمار نہیں ہوں' میں تو صرف بدی کے ایک چکر میں پھنس گیا ہوں جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں' جیسا آپ کا جی چاہے کیجئے۔''

''آپ اسپتال چلے جایئے' میرے دوست!''

''مجھے خاک بھی پروا نہیں کہ کہاں رہوں۔ آپ کا جی چاہے تو مجھے زندہ دفن کر دیں۔''

''وعدہ کیجئے' میرے دوست کہ آپ ہر معاملے میں خوبوتوف کی ہدایات پر عمل کریں گے۔''

''اچھی بات ہے' وعدہ کر رہا ہوں۔ لیکن جناب عالی! ایک بار پھر آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں بدی کے چکر میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ اب ہر بات کا حتیٰ کہ میرے بہی خواہوں کی انتہائی مخلصانہ ہمدردی کا بھی صرف ایک ہی مقصد ہوگا۔

میری تباہی۔ میں فنا ہو رہا ہو اور اتنی جرأت رکھتا ہوں کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لوں۔''

''لیکن آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی' میرے دوست!''

''اب اس قسم کی باتوں میں کیا رکھا ہے؟'' اندرئی یفیمچ نے جھلا کر کہا۔ ''زندگی کے آخری ایام میں تقریباً ہر شخص کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ کے گردے خراب ہو گئے ہیں یا یہ کہ دل پھیل گیا ہے' دوائیں استعمال کرنا شروع کر دیجئے اور کبھی آپ کو پاگل یا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک بار آپ لوگوں کی نگاہوں پر چڑھ گئے تو یقین کر لیجئے کہ بدی کے ایک چکر میں داخل ہو گئے ہیں جس سے کبھی بھی باہر نہ نکل پائیں گے۔ باہر نکلنے کے لئے آپ ہاتھ پاؤں ماریں گے تو اس دلدل میں اور بھی زیادہ گہرائی تک دھنس جائیں گے۔ ایسے موقعے پر بہتر یہی ہوتا ہے کہ ہار مان لیجئے کیونکہ کوئی بھی کوشش جو انسان سے ممکن ہے' آپ کو بچا نہیں سکتی۔ کم

از کم میری رائے تو یہی ہے۔"

اس اثناء میں کاؤنٹر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ اندریئی یفیمچ نہیں چاہتا تھا کہ ان بیچاروں کو اور زیادہ انتظار کرنا پڑے اس لئے کھڑا ہو گیا اور رخصت ہونے لگا۔ میخائیل آویزیانچ نے اس سے ایک بار پھر وعدہ لے لیا اور اسے دروازے تک چھوڑ گیا۔

اسی روز شام کو خوبوتوف اپنے پوستین اور لانگ بوٹوں میں بالکل غیر متوقع طور پر آن دھمکا اور کچھ اس انداز سے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کہا:

"میں آپ کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا ہوں۔ ایک مریض کے متعلق صلاح مشورے میں آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ چلیں گے؟"

اندریئی یفیمچ اس خیال سے کہ شاید وہ دل بہلانے کے سلسلے میں چہل قدمی کے لئے بلا رہا ہے یا پھر شاید اسے تھوڑے سے پیسے کما لینے کا موقع دینا چاہتا ہے اوور کوٹ اور ٹوپی پہن کے اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اپنی گزشتہ دن کی غلطی کی تلافی کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کے دل میں خوبوتوف کے سلسلے میں جس نے اس واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور جو اسے خجالت سے بچانے کا خواہاں معلوم ہوتا تھا، تشکر کے جذبات بھی بیدار ہو گئے۔ اسے خوبوتوف جیسے ناشائستہ شخص کی اس سوجھ بوجھ پر حیرت ضرور ہو رہی تھی۔

"آپ کا مریض ہے کہاں؟" اندریئی یفیمچ نے پوچھا۔

"اسپتال میں۔ میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس کا معائنہ کرادوں...... عجب پیچیدہ سی علامت ہے۔"

اسپتال کے احاطے میں داخل ہو کے دونوں خاص عمارت کے کنارے کنارے چلتے ہوئے اس چھوٹی سی عمارت کی طرف بڑھنے لگے جو دماغی مریضوں کے لیے وقف تھی۔ اسی دوران جانے کیوں دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی نیکیتا اپنے معمول کے مطابق اچھل کے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

''ان میں سے ایک کا پھیپھڑا کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے'' خوبوتوف نے اندریئی یفیمچ کے ساتھ وارڈ نمبر 6 میں داخل ہو کر کہا۔
''آپ یہیں میرا انتظار کیجئے' بس ابھی آتا ہوں۔ ذرا میں اپنا اسٹیتھوسکوپ لے آؤں۔''
اور وہ چلا گیا۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ ایوان دمتیرچ نصف چہرہ تکیے میں چھپائے اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ فالج کا مریض بے حس و حرکت بیٹھا چپکے چپکے رو رہا تھا اور اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ فربہ اندام کسان اور سابق ڈاک چھانٹنے والا سو رہے تھے۔ وارڈ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔
اندریئی یفیمچ ایوان دمتیرچ کے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ لیکن کوئی نصف گھنٹے بعد خوبوتوف کے بجائے نیکیتا جو ایک اسپتالی لبادہ' نیچے پہننے کے کچھ کپڑے اور سلیپریں لئے ہوئے تھا' اندر آیا۔
''کپڑے تبدیل کر لیجئے' حضور'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''یہ رہا آپ کا پلنگ'' اس نے ایک خالی پلنگ کی طرف جو کچھ دیر پہلے ہی لایا گیا تھا' اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''خدا کے فضل و کرم سے آپ اچھے ہو جائیں گے' فکر نہ کیجئے۔''
اندریئی یفیمچ پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ وہ اٹھا اور کچھ کہے بغیر جا کے اس پلنگ پر بیٹھ گیا جس کی طرف نیکیتا نے اشارہ کیا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ نیکیتا قریب ہی کھڑا انتظار کر رہا ہے اور اس نے انتہائی شرم اور گھبراہٹ کے ساتھ ایک ایک کر کے کپڑے اتارے اور خود کو بالکل برہنہ کر دیا۔ پھر وہ اسپتال کے کپڑے پہننے لگا' زیر جامے بہت چھوٹے تھے' قمیض بہت لمبی اور لبادے میں دھوئیں سے سکھائی مچھلیوں کی بو بسی ہوئی تھی۔
''خدا کے فضل و کرم سے آپ اچھے ہو جائیں گے'' نیکیتا نے ایک بار پھر کہا۔

اس نے اندرےئی یفیمچ کے کپڑے اٹھائے اور باہر نکل کے دروازہ بند کرلیا۔

''کوئی فرق تھوڑی ہے......'' اس نے اپنے لبادے کے دامنوں کو جھینپتے جھینپتے جسم کے گرد سمیٹتے ہوئے سوچا' ''کوئی فرق تھوڑی ہے' فراک کوٹ ہو یونیفارم ہو یا یہ لبادہ......''

لیکن اس کی گھڑی؟ اور نوٹ بک جو اس کی بغلی جیب میں رکھی رہتی تھی؟ اس کی سگریٹیں؟ آخر اس کے کپڑوں کو نیکیتا کہاں اٹھا لے گیا؟ شاید وہ اپنی زندگی میں پتلون واسکٹ اور بوٹ کبھی بھی نہ پہن سکے گا۔ یہ سارا واقعہ پہلے اسے عجیب و غریب اور ناقابل فہم معلوم ہوا۔ اندرےئی یفیمچ اب بھی اپنے اس کامل یقین پر قائم تھا کہ اس کی مکان مالکن بیلووا کے کمروں اور وارڈ نمبر 6 میں ذرا بھی فرق نہیں نیز یہ کہ دنیا کی ہر شے مہمل اور ہیچ ہے پھر بھی اس کے ہاتھ کانپنے لگے' پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور اس خیال سے دل ڈوبنے لگا کہ ایوان دمیترچ بیدار ہو کے اسے اسپتالی لبادے میں ملبوس دیکھے گا' وہ کھڑا ہو گیا' وارڈ میں چند قدموں تک چلا اور پھر لوٹ کر بیٹھ گیا۔

نصف گھنٹہ گزر گیا' پھر ایک گھنٹہ اور اسے وہاں بیٹھے بیٹھے عجیب بیزاری اور تھکن سی محسوس ہوئی کیا یہاں دن بھر' ہفتے بھر حتیٰ کے کئی برس تک ان مریضوں کی طرح جینا ممکن ہو سکے گا؟ وہ کچھ دیر تک بیٹھا رہا پھر چلنے لگا اور ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس پہنچ کر باہر جھانک سکتا ہے ایک بار پھر کمرے کے اندر ٹہل سکتا ہے اور اس کے بعد؟ ہر وقت بس یوں ہی بت کی طرح بیٹھے رہنا ہو گا؟ نہیں نہیں! یہ ناممکن ہے!

اندرےئی یفیمچ لیٹ گیا لیکن فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور آستین سے ماتھے کا ٹھنڈا پسینہ پونچھنے لگا جس کے دوران اسے لگا کہ اس کے چہرے سے سکھائی ہوئی مچھلیوں کی بو نکل رہی ہے۔ ''کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے'' اس نے بدحواسی سے دونوں ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان لوگوں سے ضرور بات کرنی چاہئے' یہ غلط فہمی......''

اسی لمحے دیوان دمیترچ بیدار ہو کے اٹھا اور اپنی مٹھیوں پر گالوں کو ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے فرش پر تھوکنے کے بعد ڈاکٹر کو نڈھال نگاہوں سے دیکھا جس سے اندازہ ہوتا تھا

کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے نیند سے مارے ہوئے چہرے پر فاتح اور بے رحم ہونے کا تاثر چھا گیا۔

''اخاہ! آپ کو بھی اس جہنم میں جھونک دیا گیا!'' اس نے نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں ایک آنکھ پوری طرح کھولے بغیر ہی کہا۔ ''بڑی خوشی ہوئی! ابھی تک آپ دوسروں کا خون چوستے تھے اب خود آپ کا چوسا جائے گا۔ بہت خوب!''

''کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے'' اندرےئی یفیمچ نے اس کے الفاظ سے تشویش میں مبتلا ہو کر کہا۔ اس نے اپنے شانے اچکائے اور ایک بار پھر کہا۔ ''ضرور کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے......''

ایوان دمتیرچ نے فرش پر دوبارہ تھوکا اور لیٹ گیا۔

''بدبخت زندگی!'' وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑانے لگا۔ ''اور اس زندگی کو جو چیز اتنی تلخ اور اذیت دہ بنا دیتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس کا خاتمہ برداشت کی جانے والی تکلیف کے کسی ہرجانے کی شکل میں نہیں دیوتا بنا دیئے جانے کی شکل میں ہوگا۔ اسپتال کے دو خدمت گار آئیں گے' ایک ہاتھوں کو پکڑ لے گا اور دوسرا پیروں کو اور لاش کو تہہ خانے میں پہنچا دیں گے۔ ہونہہ! خیر کوئی بات نہیں...... ہمارے دن دوسری دنیا میں پھریں گے......میرا بھوت یہاں آ کر ان سوروں پر ہول طاری کر دے گا۔ میں ان سب کا جینا عذاب کر دوں گا......''

اتنے ہی میں موئے سینکھا واپس لوٹا اور ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اس کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ ''ایک کوپیک دونا!''

اندرئیی یفیمچ نے کھڑکی کے پاس جا کے باہر کھیت پر نظریں دوڑائیں۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور دائیں جانب سرد ارغوانی چاند ابھر رہا تھا۔ اسپتال کے جنگلے سے قریب ہی یہی کوئی سات سو فٹ کے فاصلے پر پتھروں کی چہار دیواری کے اندر ایک بلند اور سفید عمارت کھڑی تھی۔ یہ تھا قید خانہ۔

''تو یہ ہے حقیقت!'' اس نے سوچا اور ڈر کے مارے کانپ اٹھا۔

ہر شے ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی: چاند بھی' قید خانہ بھی' جنگلے کے بالکل اوپر الٹی لگی ہوئی کیلوں کی ابھری نوکیں بھی اور بہت دور اینٹوں سے ابھرتے ہوئے شعلے بھی۔ اتنے میں اس کے پیچھے کسی نے ٹھنڈی سانس لی۔ اندریئی یفیمچ مڑا تو اس نے ایک شخص کو کھڑے دیکھا جس کے سینے پر تمغے چمک رہے تھے اور جو مسکرا مسکرا کے شرارت سے آنکھ مار رہا تھا۔ یہ سماں بھی ڈراؤنا تھا۔

اندریئی یفیمچ نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ چاند میں کوئی غیر معمولی بات ہے نہ قید خانے کی عمارت میں' رہے تمغے تو جن کا دماغ ٹھیک ہوتا ہے وہ انہیں لگاتے ہی نہیں اور یہ کہ وقت آنے پر ہر شے کو گل سڑ کے خاک میں مل جانا ہے لیکن اچانک مایوسی نے اس پر غلبہ پالیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کے انہیں ہلانے کی کوشش کی۔ سلاخوں کا جنگلا بہت مضبوط تھا اور اس میں خفیف سی جنبش بھی نہ پیدا ہوئی۔

تب وہ اپنے خوف سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں ایوان دمیترچ کے پلنگ کے پاس پہنچا اور اس کے کنارے بیٹھ گیا۔

''میری ہمت جواب دے گئی' عزیز دوست!'' اس نے تھرتھر کانپتے اور پیشانی کا ٹھنڈا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ جواب دے گئی۔

''تو فلسفہ بگھارنے کی کوشش کیجئے نا'' ایوان دمیترچ نے مذاق اڑایا۔ ''اوہ میرے خدا!...... جی ہاں...... ایک بار آپ نے کہا تھا کہ روس میں فلسفے کا تو وجود بھی نہیں لیکن ہر شخص حتیٰ کہ گنوار تک فلسفی بنے پھرتے ہیں۔ آخر گنواروں کے فلسفے سے کسی کو نقصان کیا پہنچتا ہے؟'' اندریئی یفیمچ کی آواز سے لگتا تھا کہ یا تو ابھی ابھی رو پڑنے کو ہے یا پھر ایوان دمیترچ کے دل میں رحم کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''تو پھر آخر یہ خباثت بھری ہنسی کیوں' میرے دوست؟ عام لوگوں کو اطمینان میسر نہیں تو پھر وہ فلسفے کا سہارا نہ لیں تو کریں بھی کیا؟ کسی ذہین' اعلیٰ تعلیم یافتہ' خوددار اور آزاد شخص کے لئے اس

کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ ایک واہیات گندے قصبے میں ڈاکٹر بن جائے، اور اپنی باقی زندگی کو سینگی سے خون نکالنے، جونکوں اور رائی کے لیپ کے لئے وقف کر دے! عطائی پن، تنگ نظری، بیہودگی! اوہ! میرے خدا!"

"یہ سب بکواس ہے۔ ڈاکٹری کا پیشہ آپ کو پسند نہیں تو آپ وزیر ریاست کیوں نہیں بن گئے تھے؟"

"نہیں نہیں! کچھ بھی کرنا ممکن نہیں! ہم لوگ کمزور ہیں میرے دوست!...... مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی، ہنسی خوشی دانائی کے ساتھ غور و خوض کیا کرتا تھا لیکن جیسے ہی مجھے زندگی کا سخت دھکا لگتا ہے ویسے ہی میری ہمت جواب دے جاتی ہے...... ناتوانی...... ہم لوگ کمزور اور بدبخت ہیں ...... اور آپ بھی میرے دوست! آپ ذہین اور عالی ظرف ہیں، نیک خواہشات آپ کی رگوں میں ماں کے دودھ کے ساتھ سرایت کر گئی تھیں لیکن آپ نے زندگی ابھی ٹھیک سے شروع بھی نہیں کی تھی کہ تھک گئے، بیمار پڑ گئے...... کمزور ہیں کمزور!"

اندھیرا ہو گیا تو اندریئی یفیمچ کو ذلت کے احساس اور خوف کے علاوہ اور بھی کسی بات نے مسلسل پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ آخر کار اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ بیئر اور سگریٹوں کی طلب تھی۔

"میں ذرا دیر کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں، میرے دوست!" اس نے کہا۔ "کہوں گا کہ یہاں روشنی کا انتظام کر دیں...... تاریکی میرے لئے ناقابل برداشت ہے......" اندریئی یفیمچ نے دروازے کے پاس جا کے اسے کھولا لیکن فوراً ہی نکیتا اچھل کے کھڑا ہو گیا اور اس کا راستہ روک لیا۔ "کہاں جا رہے ہیں، اس کی اجازت نہیں!" اس نے کہا۔ "سونے کا وقت آ گیا!"

"میں صرف چند منٹ کے لئے باہر جا رہا ہوں، احاطے میں ذرا ٹہل آؤں" اندریئی یفیمچ نے جو بھونچکا ہو گیا تھا کہا۔

"نہیں نہیں! اس کی اجازت نہیں۔ آپ کو خود ہی معلوم ہے۔"

اور نیکیتا نے باہر سے بھڑ سے دروازہ بند کیا اور اس سے اپنی پیٹھ ٹکا دی۔

''لیکن میرے باہر جانے سے کسی کو کیا تکلیف پہنچ سکتی ہے؟'' اندرے ئی یفیمچ نے شانے اچکاتے ہوئے سوچا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے! نیکیتا 'میرا باہر جانا ضروری ہے!'' اس نے بھرائی آواز سے کہا۔ ''بہت ضروری ہے!''

''بیکار کا ہنگامہ نہ کھڑا کیجئے'' نیکیتا نے ڈانٹا۔

''کیسی شرمناک بات ہے!'' اچانک ایوان دمیترچ نے اٹھتے ہوئے چلایا۔'' آخر اس شخص کو حق کیا ہے کہ لوگوں کو باہر جانے سے روکے؟ قانون میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مقدمہ چلائے بغیر کسی کو اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا! یہ تو جبر ہے جبر! بالکل من مانی!''

''بے شک یہ من مانی ہے!'' اندرے ئی یفیمچ نے اس غیر متوقع حماقت سے شیر ہو کر کہا۔'' میں باہر جانا چاہتا ہوں' بہت ضروری ہے! اسے مجھ کو روکنے کا کوئی اختیار نہیں! باہر نکلنے دو' تم سے کہہ رہا ہوں!''

''ارے درندے! سن رہا ہے کہ نہیں؟'' ایوان دمیترچ نے دروازے کو مکے سے پیٹتے ہوئے کہا۔

'' دروازہ کھول ورنہ میں اسے توڑ ڈالوں گا! جلاد کہیں !'' '' دروازہ کھولو!'' اندرے ئی یفیمچ غصے سے کانپتے ہوئے چلایا۔'' میں اصرار کر رہا ہوں!''

''کرتے رہو!'' نیکیتا نے دروازے کی دوسری طرف سے جواب دیا۔'' کرتے رہو!''

''کم از کم جا کے یوگینی فیدورچ ہی کو بلا لاؤ! ان سے کہنا کہ میں......انہیں پل بھر کے لئے بلا رہا ہوں!''

''کل وہ بلائے بغیر ہی آ جائیں گے۔''

'' ارے یہ لوگ ہمیں کبھی بھی نکلنے نہ دیں گے!'' ایوان دمیترچ نے کہا۔

وقت تک بند رکھیں گے جب تک ہم سڑ گل نہ جائیں! اوہ خدا! کیا یہ سچ ہو سکتا ہے کہ دوسری دنیا میں جہنم کا وجود نہیں اور ان بدمعاشوں کو معاف کر دیا جائے گا؟ آخر انصاف کہاں ہے؟ ارے بے ایمان، دروازہ کھول، میرا دم گھٹا جا رہا ہے!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز سے چیختے ہوئے دروازے کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ ''میں دروازے سے سر ٹکرا ٹکرا کر بھیجا باہر نکال دوں گا! قاتل کہیں کے!''

نیکیتا نے یکبارگی دروازہ کھول کے اندریئی یفیمچ کو اپنے ہاتھوں اور ایک گھٹنے سے سختی کے ساتھ پیچھے دھکیلا اور پھر اس کے منہ پر ایک زوردار مکا مار دیا۔ دوسرے ہی لمحے اندریئی یفیمچ کو ایسا لگا جیسے وہ کسی زبردست نمکین لہر میں سر سے پاؤں تک ڈوب گیا اور وہ اسے گھسیٹتا ہوا اس کے پلنگ کی طرف لے چلا۔ اس کے منہ کا ذائقہ واقعی نمکین ہو گیا اور صاف ظاہر تھا کہ مسوڑھوں سے خون بہہ نکلا ہے۔ اس نے اپنے بازو یوں ہلائے جیسے اس لہر سے اوپر ابھرنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کے ہاتھ کسی پلنگ کے پچھلے حصے پر جا پڑے جس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ نیکیتا نے اس کی پیٹھ پر دوبارہ وار کیا۔

ایوان دمیترچ کے منہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ تو اس شخص کو بھی زدوکوب کیا جا رہا تھا۔

اور پھر سناٹا چھا گیا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے پیلی چاندنی اندر داخل ہو رہی تھی اور فرش پر ایک سایہ پڑا ہوا تھا جو جال جیسا لگ رہا تھا۔ ہر شے کتنی مہیب ہو گئی تھی! اندریئی یفیمچ ڈرا سہا لیٹا ہوا تھا، سانس نہ لینے کی کوشش اور نئی ضرب کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی شخص نے اس کے جسم میں ہنسیا چبھو کر اسے سینے اور پیٹ میں کئی بار گھما دیا ہو۔ درد کی شدت سے اس نے اپنے تکیے کو کاٹ کاٹ لیا پھر دانت بھینچ لئے۔ اتنے میں اچانک ایک خیال اس کے سارے ذہن پر چھا گیا، مہیب اور ناقابل برداشت خیال کہ اس وقت وہ جس درد میں مبتلا تھا اُسے چاندنی میں سیاہ پرچھائیوں جیسے نظر آتے ہوئے یہ سب لوگ ایک دن کے بعد دوسرے دن، مسلسل کئی برسوں سے برداشت کرتے آ رہے ہوں گے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہو سکا کہ بیس سال سے

زائد کے اس طویل عرصے میں اسے اس کا پتا ہی نہ چلا یا اس نے خود ہی چاہا کہ پتا نہ چلے؟ اسے علم نہیں ہو سکا' ہلکا سا تصور بھی نہیں تھا کہ درد کس کو کہتے ہیں' اس لئے اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا لیکن اس کے ضمیر نے 'نیکیتا جیسے سخت اور سنگ دل ضمیر نے اسے لرزہ براندام کر دیا۔ وہ اچھل پڑا کہ اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ اٹھے گا' نیکیتا' خوبوتوف' سپرنٹنڈنٹ اور طبی معاون کو ہلاک کر کے خود اپنی جان لے لے گا لیکن نہ تو اس کے منہ سے آواز نکل سکی اور نہ ہی اس کی ٹانگوں نے اس کا کہا مانا۔ اس نے ہانپ ہانپ کے سانس لیتے ہوئے اپنے اسپتالی لبادے اور قمیض کو تار تار کر دیا اور بے ہوش ہو کے پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

اگلی صبح کو وہ بیدار ہوا تو درد سے سر پھٹا جا رہا تھا' کانوں میں بھن بھناہٹ سی ہو رہی تھی اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اسے اپنی گذشتہ شام کی کوتاہیوں کو یاد کر کے کسی قسم کی خجالت نہ محسوس ہوئی۔ اس نے کسی بزدل جیسا طرز عمل اپنایا تھا' چاند تک سے خوف زدہ ہو گیا تھا اور ایسے خیالات اور جذبات کا پورے خلوص کے ساتھ اظہار کیا تھا جن سے اپنی وابستگی کا اسے کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا مثلاً بے اطمینانی کی بناء پر معمولی لوگوں کے بھی فلسفی بن بیٹھنے کا خیال۔ لیکن اب اسے کسی بات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا بس یوں ہی بے حس و حرکت' بالکل خاموشی اپنے پلنگ پر پڑا رہا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں!" اس سے سوالات کیے گئے تو اس نے سوچا۔ "میں ان لوگوں کو کوئی جواب نہ دوں گا..... مجھے کوئی پروا نہیں۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد میخائیل آویریانچ چائے کا ایک پیکٹ اور تھوڑی سی جیلی لے کر اس سے ملنے آیا۔ داریا بھی آئی اور کوئی گھنٹے بھر تک اس کے پلنگ کے پاس مغموم و ملول کھڑی رہی۔ اور ڈاکٹر خوبوتوف اسے دیکھنے آیا۔ وہ اپنے ساتھ پوٹاشیم برومائیڈ کی ایک شیشی بھی لایا تھا اور اس نے نیکیتا کو کسی چیز کا دھواں دے کر وارڈ کی فضا

کو صاف کر دینے کی ہدایت کی۔

شام کو اندریئی یفیمچ کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں اور یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ پہلے اسے بخار چڑھنے جیسی سردی اور متلی محسوس ہوئی' ایسا لگا جیسے کوئی بڑی گھناؤنی چیز سارے جسم پر' انگلیوں کے ناخنوں تک پھیلتی جا رہی ہے' اس کے پیٹ سے اٹھ کر سر تک پہنچ رہی ہے' آنکھوں اور کانوں میں گھستی چلی جا رہی ہے۔ اندریئی یفیمچ کو سب کچھ ہرا ہرا نظر آنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ آخری گھڑی آن پہنچی ہے اور اسے یاد آیا کہ ایوان دمیترچ' میخائیل آویریانچ اور دوسرے لاکھوں افراد حیات ابدی میں یقین رکھتے ہیں۔ اگر ایسی کسی شے کا وجود ہو تو؟ لیکن اس کے دل میں حیات ابدی کی ذرا بھی خواہش نہ پیدا ہوئی اور اس کے متعلق یوں ہی سرسری طور پر ہی سوچا۔ ڈھیروں بہت ہی خوبصورت بارہ سنگے جن کے متعلق وہ گذشتہ روز پڑھ رہا تھا' تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرے' پھر کسی عورت نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں وہ ایک رجسٹرڈ لفافہ لئے ہوئے تھے...... میخائیل آویریانچ نے کچھ کہا...... پھر سب کچھ غائب ہو گیا اور اندریئی یفیمچ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے ہوش ہو گیا۔

اسپتال کے دو خدمت گار وارڈ میں آئے' ایک نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے' دوسرے نے پاؤں اور اٹھا کر گرجے میں رکھ آئے۔ وہاں وہ میز پر آنکھیں کھولے پڑا رہا اور رات کو چاند نے اس پر ضیاباری کی۔ اگلی صبح کو سرگیئی سرگیچ نے وہاں پہنچ کر صلیب کے سامنے خضوع وخشوع سے عبادت کی اور اپنے سابق سربراہ کی آنکھیں بند کر دیں۔

دو دن بعد اندریئی یفیمچ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ تدفین کے وقت صرف دو افراد موجود تھے' میخائیل آویریانچ اور داریا۔

ضروری کتابیں ہر گھر اور لائبریری کے لئے

گل خان نصیر

- کوچ و بلوچ
- تاریخ خوانین قلات
- بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار
- بلوچستان قدیم و جدید تاریخ کی روشنی میں
- تاریخ بلوچستان

طاہر بزنجو

- گریٹ گیم اور بلوچستان
- بابائے بلوچستان بلوچ کیس

شکیل احمد بلوچ

- بلوچستان اور عالمی سیاست
- بلوچستان کی پکار

بلوچستان کے قبائل

- بلوچستان کے قبائل (مکمل)
- کوئٹہ، پشین، ژوب (1)
- ساراوان، کچھی، بولان اور جھالاوان (2)
- لسبیلہ، لورالائی، سبی اور مری بگٹی (3)
- چاغی، خاران، مکران (4)
- بلوچ پشتون قبائل۔ شجرہ (5)
- بلوچستان قوم نسل اور تاریخ
- بلوچستان تاریخ کے آئینے میں
- بلوچستان اور استعماری ہتھکنڈے
- تاریخ بلوچ قوم و خوانین بلوچ
- بلوچستان کی معروف شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا (3 جلد)
- ثقافت و ادب وادی بولان میں
- بگٹی نامہ (دو جلد)
- شہید بلوچستان نواب اکبر بگٹی حیات و مضامین
- نواب شہباز اکبر بگٹی زندہ ہیں
- نواب اکبر بگٹی شہید عوام کا خراج
- نواب اکبر بگٹی قتل کیوں کیا گیا
- خود اختیار کردہ جلاوطنی
- مقصد حیات (سوانح غوث بخش بزنجو)

شاہ محمد مری

- بابو شورش
- ہوچی منہ
- ماؤزے تنگ
- وفا کا تذکرہ
- کارواں کے ساتھ
- شاہ عنایت شہید
- عبدالطیف بھٹائی
- گل خان نصیر
- بلوچ قوم
- مری بلوچ جنگ مزاحمت

عابد میر

- بلوچ کیس
- بلوچستان کا عکس
- سلگتا بلوچستان
- آرٹ آف وار
- تاریخ قلات
- تاریخ بلوچان ہند
- مری بلوچ کلچر
- مکران
- تاریخ بلوچستان
- سیستان اور بلوچستان
- مہمات بلوچستان
- بلوچستان کے بلوچی شعراء
- بلوچستان مسئلہ کیا ہے
- نواب خیر بخش مری انٹرویو
- قومی تحریکیں اور بلوچستان
- چاکر اعظم
- پاکستان، بلوچستان شاہی جرگہ
- افغانستان تاریخ کا سفر
- احمد شاہ درانی
- پشتونوں کی تاریخ
- پشتونوں کے رسم و رواج

تراجم

خلیل جبران

- النبی، جنت ارضی
- دیوانہ، خطوط جبران
- الم وانبساط، ابن آدم
- طوفان، ارضی دیوتا
- فلسفہ، شاعری، نظمیں
- خواب و خیال
- کلیات جبران (3 جلد)

گرو رجنیش اوشو

- کلیات اوشو
- تعلیمات
- روحانیت کی جانب
- علم انقلاب اور آزادی
- زندگی موت اور محبت
- زرتشت
- سگ پرست
- آزادی کا افق
- افتادگان خاک
- داستان ہٹلر (2 جلد)
- جنگ عظیم دوم
- عالمی ادب سے انتخاب۔ ٹالسٹائی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ چیخوف
- عالمی ادب سے انتخاب۔ گورکی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ پشکن
- موپساں کے افسانے
- سرگزشت اسیر
- فلسفہ افلاطون
- آزادی ہند کی کہانی مولانا آزاد کی زبانی
- خامہ بہ جوش
- سارے سخن ہمارے (کلیات ساحر)
- بلونت سنگھ کے افسانے